KCTIS LIBRARY
11345
7601
MALEGAON

کتاب پھٹنے یا گم ہونے کی صورت میں کتاب کی
قیمت کی دوگنی رقم ادا کرنا پڑے گی
کتاب لیجانے کے [illegible] تاریخ [illegible]
[illegible]

ISCUS LIBRARY
Near A. T. T. High School,
MALEGAON DIST. NASIK.

# پردے کے پیچھے

سعادت حسن منٹو

ISCUS LIBRARY
11345
7601
MALEGAON

مکتبہ نگین۔ پوسٹ بکس ۱۴۶۴ دہلی

AZAD KITAB GHAR.

جملہ حقوق محفوظ

مارچ ۱۹۵۳ء

بار اول ——— ایکہزار

قیمت دو روپے آٹھ آنے

پبلشر

مکتبہ رنگین دہلی

پوسٹ بکس ۱۲۷۴ دھلی

(الامان پرنٹنگ پریس۔ ترکمان گیٹ۔ دہلی)

IQBAL LIBRARY
11341
7601
MALEGAON

# پردے کے پیچھے

منٹو جو کچھ دیکھتا ہے وہی لکھ دیتا ہے۔ اس نے اشوک کمار، شیام، نرگس، نسیم، دی، ایچ ڈیسائی، کے کے، ستارہ کو قریب سے دیکھا ہے۔ بہت قریب سے اور جو کچھ دیکھا ہے وہی لکھ دیا ہے۔

منٹو کئی فلموں کے مکالمے اور سین یو لکھ چکا ہے۔ اور اس نے فلم "آٹھ دن" میں پاگل کا کردار بھی ادا کیا ہے۔ اس وقت کسے معلوم تھا کہ پاگل کا کردار ادا کرنے والا منٹو چھ سال بعد واقعی پاگل ہو جائے گا۔

پاگل خانے سے واپس آنے کے بعد منٹو نے ان فلم اسٹاروں کے متعلق لکھا جن کے عشق میں وہ امرت سر سے لاہور، لاہور سے دلی اور دلی سے بمبئی پہنچا۔

"پردے کے پیچھے" میں سعادت حسن منٹو نے ان تمام فلمسٹاروں کی زندگی کے وہ راز طشت از بام کئے ہیں جو آج تک پردۂ راز میں تھے۔

فلمسٹاروں کے علاوہ منٹو نے منٹو کے متعلق بھی لکھا ہے۔

ایچ، آر، رنگین

# فہرست


۱ — ہپ ٹلا — ۵

۲ — ہائے تم کتنی پیلی ہو — ۳۴

۳ — معصوم ادائیں الھڑ غمزے — ۵۴

۴ — کے کے — ۸۱

۵ — ستارہ گردش میں — ۹۳

۶ — بی بی کی بے بی — ۱۲۷

۷ — کشت زعفران — ۱۵۱

۸ — پردے کے پیچھے — ۱۶۷

LIBRARY
11345
7601
MALEGAON



# ہپ ٹُلا

اپریل کی تئیس یا چوبیس تھی۔ مجھے اچھی طرح یاد نہیں رہا۔ پاگل خانے میں شراب چھوڑنے کے سلسلے میں زیرِ علاج تھا۔ کہ شیام کی موت کی خبر ایک اخبار میں پڑھی۔ ان دنوں ایک عجیب و غریب کیفیت مجھ پر طاری تھی۔ بے ہوشی اور نیم بے ہوشی کے ایک چکر میں پھنسا ہوا تھا۔ کچھ سمجھ نہیں آتا تھا کہ ہوشمندی کا علاقہ کب شروع ہوتا ہے۔ اور میں بے ہوشی کے عالم میں کب پہنچتا ہوں۔ دونوں کی سرحدیں کچھ اس طرح آپس میں گڈ مڈ ہو گئی تھیں کہ میں خود کو "نومینز لینڈ" میں بھٹکتا محسوس کرتا تھا۔

شیام کی موت کی خبر چنانچہ جب میری نظروں سے گزری۔ تو میں نے سمجھا یہ سب ترکِ شراب کی کارستانی ہے۔ جس نے میرے ذہن میں ہلچل پیدا کر رکھی ہے۔ اس سے قبل نیم خوابی کے عالم میں کئی عزیزوں کی موتیں میرے لیے واقع ہو چکی تھیں۔ اور نیم ہوشمندی کے وقت مجھے یہ بھی معلوم ہو چکا تھا۔ کہ وہ سب کے سب زندہ ہیں۔ اور میری صحت کے لئے دعائیں مانگ رہے ہیں۔

مجھے اچھی طرح یاد ہے جب میں نے یہ خبر پڑھی۔ تو ساتھ والے کمرے کے پاگل سے کہا "جانتے ہو۔ میرا ایک نہایت ہی عزیز دوست مر گیا ہے"
اس نے پوچھا "کون ہے"

میں نے گلوگیر آواز میں جواب دیا۔ "شیام"

"کہاں؟ یہاں پاگل خانے میں؟"

میں نے کوئی جواب نہ دیا۔ اوپر تلے کئی تصویریں میرے مضطرب دماغ میں اُبھریں۔ جن میں شیام تھا مسکراتا شیام، ہنستا شیام، شور مچاتا شیام، زندگی سے بھرپور شیام۔ موت اور اس کی ہولناکیوں سے قطعاً ناآشنا شیام ——— میں نے سوچا جو کچھ میں نے پڑھا ہے بالکل غلط ہے ——— اخبار کا وجود میرے دماغ کی اختراع ہے۔

آہستہ آہستہ الکحل کی دھند دماغ سے ہٹنے لگی۔ اور میں تمام واقعات کو ان کے صحیح خدوخال میں دیکھنے لگا۔ مگر یہ عمل کچھ اس قدر سست رفتار تھا کہ جب میں شیام کی موت کے حادثے سے دوچار ہوا تو مجھے زبردست دھکا نہ لگا۔ مجھے یوں محسوس ہوا۔ جیسے وہ عرصہ ہوا مر چکا تھا۔ اور اس کی موت کا صدمہ بھی عرصہ ہوا مجھے پہنچ چکا تھا۔ اب صرف اس کے آثار باقی تھے۔ صرف ملبہ رہ گیا تھا آہستہ آہستہ جس کی میں کھدائی کر رہا تھا۔ شکستہ اینٹوں کے ڈھیر میں کبھی شیام کی مسکراہٹ دبی ہوئی مل جاتی تھی۔ کبھی اس کا بانکا قہقہہ۔

پاگل خانے سے باہر فرزانوں کی دنیا میں یہ مشہور تھا کہ سعادت حسن منٹو، شیام کی موت کی خبر سن کر پاگل ہو گیا ہے۔ اگر ایسا ہوتا تو مجھے بہت افسوس ہوتا شیام کی موت کی خبر سن کر مجھے زیادہ ہوشمند ہو جانا چاہیے تھا۔ دنیا کی بے ثباتی کا احساس میرے دل و دماغ میں زیادہ شدید ہو جانا چاہیے تھا۔ اور انتقامی جذبے کے تحت اپنی زندگی کو پوری طرح استعمال کرنے کا عزم میرے اندر پیدا ہو جانا چاہیے تھا۔

...... شیام کی موت کی خبر سن کر پاگل ہو جانا محض پاگل پن تھا ؎

تیشے بغیر مر نہ سکا کوہکن اسدؔ   سرگشتۂ خمار رسوم و قیود تھا

رسوم وقیود کے بتوں کو توڑنے والے شیام کی موت پر پاگل ہو جانا اس کی بہت بڑی توہین تھی۔

شیام زندہ ہے اپنے دو بچوں میں جو اس کی بے لوث محبّت کا نتیجہ ہیں۔ تاجی (ممتاز) میں جو بقول اس کے اس کی کمزوری تھی۔ اور ان تمام عورتوں میں جن کی اوڑھنیوں کے آنچل اس کے محبت بھرے دل پر گاہے گاہے سایہ کرتے رہے اور میرے دل میں جو صرف اس لئے سوگوار ہے۔ کہ وہ اس کی موت کے سرہانے یہ نعرہ بلند نہ کر سکا ”شیام زندہ باد!“

مجھے یقین ہے۔ موت کے ہونٹوں کو بڑے خلوص سے چومتے ہوئے اس نے اپنے مخصوص انداز میں کہا ہوتا ”منٹو — خدا کی قسم ان ہونٹوں کا مزا کچھ اور ہی ہے“

میں جب بھی شیام کے متعلق سوچتا ہوں۔ تو مجھے مشہور روسی ناول نویس آر تزبی شیف کا ہیرو سیبنائن یاد آجاتا ہے۔ شیام عاشق تھا، عشق پیشہ نہیں تھا وہ ہر خوبصورت چیز پر مرتا تھا — میرا خیال ہے کہ موت ضرور خوبصورت ہو گی ورنہ وہ کبھی نہ مرتا۔

اس کو تپش اور حدت سے پیار تھا۔ لوگ کہتے ہیں کہ موت کے ہاتھ ٹھنڈے ہوتے ہیں۔ میں نہیں مانتا۔ شیام ٹھنڈے ہاتھوں کا بالکل قائل نہیں تھا اگر واقعی موت کے ہاتھ ٹھنڈے ہوتے تو اس نے یہ کہہ کر ایک طرف جھٹک دیئے ہوتے

”ہٹو بڑی بی — تم میں خلوص نہیں ہے“

مجھے ایک خط میں لکھتا ہے:۔

قصہ یہ ہے جانِ من اکہ یہاں ایک ”ہیپ ٹلا“ ہے۔ لیکن اصلی ”ہیپ ٹلا“ یہاں سے بہت دور۔ لیکن میری پوچھتے ہو۔ تو کبھی کوئی ایسی وجہ معلوم نہیں ہوتی کہ حرفِ شکایت لب پر لاؤں ۔۔۔۔۔۔

زندگی خوب گذر رہی ہے ——— رندی وہ مے نوشی بامے نوشی
در رندی! ساتھ ساتھ چل رہی ہے۔ تاجی (ممتاز) چھ مہینے کے عرصے
کے بعد واپس آ گئی ہے وہ ابھی تک میری ایک بڑی زبردست کمزوری
ہے۔ اور تم جانتے ہو عورت کی محبت کی گرمی کی راحت محسوس کرنا کتنی
راحت انگیز چیز ہے! ........ آخر میں انسان ہوں ایک
نورمل انسان۔

نگار (نگار سلطانہ) کبھی کبھی ملتی ہے۔ لیکن آدلین حق "ت" کا ہے۔
شاموں کو تمہاری "دانشمندانہ بکواس" اکثر یاد آتی ہے۔

شیام نے اس خط میں ایک لفظ "ہرپ ٹلا" استعمال کیا ہے۔ اسکی تشریح
چونکہ خالی از دلچسپی نہیں۔ اس لئے آپ بھی سُن لیجئے۔

میں بمبئی ٹاکیز میں ملازم تھا۔ ان دنوں کمال امروہی کی فلمی کہانی "حویلی"
(جو محل کے نام سے فلمائی گئی) کی تشکیل و تکمیل ہو رہی تھی۔ اشوک۔ واچا، حسرت
(لکھنوی) اور میں سب ہر روز بحث و تمحیص میں شامل ہوتے تھے۔ ان نشستوں میں
کام کے علاوہ کبھی کبھی خوب زوروں پر گپ بھی چلتی تھی۔ ایک دوسرے سے
مذاق ہوتے۔ شیام کو جب فلم "مجبور" کی شوٹنگ سے فراغت ہوتی۔ تو وہ بھی
ہماری محفل میں شریک ہو جاتا۔

کمال امروہی کو عام گفتگو میں بھی ٹھیٹ قسم کے ادبی الفاظ استعمال کرنے
کی عادت ہے میرے لئے یہ ایک مصیبت ہو گئی تھی۔ اسلئے اگر عام فہم انداز میں
کہانی کے متعلق اپنا کوئی نیا خیال پیش کرتا تو اس کا اثر کمال پر پوری طرح نہیں ہوتا
تھا۔ اس کے برعکس اگر میں زوردار الفاظ میں اپنا عندیہ بیان کرتا تو اشوک و رواچا
کی سمجھ میں کچھ نہ آتا۔ چنانچہ میں ایک عجیب قسم کی ملی جلی زبان استعمال کرنے لگا۔

ایک روز صبح گھر سے بمبئی ٹاکیز آتے ہوتے مَیں نے ٹرین میں اخبار کا اسپورٹس کالم کھولا۔ بریبرن اسٹیڈیم میں کرکٹ میچ ہو رہے تھے۔ ایک کھلاڑی کا نام کچھ عجیب و غریب تھا۔ "ہرپ ٹلا" ـــــ ایچ، ای، پی، ٹی، یو، ایل، ایل، ایچ، اے ـــــ "ہرپ ٹلا" ..... مَیں نے بہت سوچا کہ آخر یہ کیا ہو سکتا ہے۔ مگر کچھ سمجھ میں نہ آیا۔ شاید ہیبت اللہ کی بگڑی ہوئی شکل تھی۔

اسٹوڈیو پہنچا تو کمال کی کہانی کی فلمی تشکیل کا کام شروع ہوا۔ کمال نے اپنے مخصوص ادبیانہ اور اثر پیدا کرنے والے انداز میں کہانی کا ایک باب سُنایا۔ مجھ سے اشوک نے رائے طلب کی۔ "کیوں منٹو؟"

معلوم نہیں کیوں، میرے مُنہ سے نکلا "ٹھیک ہے ـــ مگر ہرپ ٹلا نہیں!"

بات کچھ بن ہی گئی۔ "ہرپ ٹلا" میرا مطلب بیان کر گیا۔ مَیں کہنا یہ چاہتا تھا کہ سیچوئشن زور دار نہیں ہے۔

کچھ عرصے کے بعد حسرت نے اسی باب کو ایک نئے طریقے سے پیش کیا۔ میری رائے پوچھی گئی۔ تو میں نے اب کی دفعہ ارادی طور پر کہا۔ "بھئی حسرت بات نہیں بنی ـــ کوئی ہرپ ٹلا چیز پیش کرو۔" "ہرپ ٹلا"

دوسری مرتبہ ہرپ ٹلا کہہ کر میں نے سب کی طرف ردِّ عمل معلوم کرنے کے لئے دیکھا یہ لفظ اب معنی اختیار کر چکا تھا۔ چنانچہ اس نشست میں بلا تکلّف میں نے اسے استعمال کیا۔ ہرپ ٹلیٹی نہیں۔ ہرپ ٹولائز کرنا چاہیئے وغیرہ وغیرہ۔ لیکن اچانک ایک بار اشوک مجھ سے مخاطب ہوا۔ "ہرپ ٹلا کا اصل مطلب کیا ہے؟ کس زبان کا لفظ ہے؟"

شیام اس وقت موجود تھا۔ جب اشوک نے مجھ سے یہ سوال کیا۔ اس نے زور کا قہقہہ لگایا۔ اس کی آنکھیں سکڑ گئیں۔ ٹرین میں وہ میرے ساتھ تھا۔ جب مَیں نے کرکٹ کے کھلاڑی کے اس عجیب و غریب نام کی طرف اس کو متوجہ کیا۔ ہنس ہنس کے دُہرا

ہوتے ہوئے اس نے سب کو بتایا کہ یہ منٹو کی نئی منٹویت ہے ـــــ جب کچھ سمجھ میں نہ آیا۔ تو ہپ ٹلا کو کھینچ کر فلمی دُنیا میں لے آیا۔ مگر کھینچا تانی کے بغیر یہ لفظ بمبئی کے فلمی حلقوں میں رائج ہو گیا۔

۲۹/۴/۸ کے خط میں شیام مجھے لکھتا ہے:۔

پیارے منٹو! اب کی دفعہ تم پھر خاموش ہو۔ تمہاری یہ خاموشی مجھے بہت دق کرتی ہے۔ اس کے باوجود کہ میں تمہارے دماغی تساہل سے بخوبی واقف ہوں۔ میں غصّے سے دیوانہ ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا جبکہ تم یک لخت چُپ سادھ لیتے ہو۔ اِس میں شک نہیں۔ کہ میں بھی کوئی بہت بڑا خط باز نہیں ہوں۔ لیکن مجھے ایسے خط لکھنے اور وصول کرنے میں لطف حاصل ہوتا ہے جو ذرا "الگ قسم" کے ہوں .....

یعنی ہپ ٹلا!

لیکن ہپ ٹلا یہاں بمبئی میں نایاب چیز ہو گئی ہے ..... اسے کاغذ پر لکھو تو کم بخت "ہیپٹل" بن جاتی ہے۔ اور اگر یہ ہپ ٹلی بھی دستیاب نہ ہو تو بتاؤ کتنی کوفت ہوتی ہے۔ معاف کرنا۔ اگر میں نے ہیپٹولائز کرنا شروع کر دیا ہو ..... لیکن کیا کروں۔ جب حقیقتیں گم ہو جائیں تو انسان ہیپٹولیٹ ہی کرتا ہے۔ مگر مجھے کچھ پروا نہیں کہ تم کیا کہو گے کیا نہیں کہو گے۔ میں اِتنا جانتا ہوں۔ اور تمہیں اس کا علم ہو گا۔ کہ تم ایسے بڑے ہپ ٹلا کو اس میدان میں شکست دینے کا سہرا صرف میرے ہی سر پہ ہے۔

منٹو! کسی نے کہا ہے کہ جب عاشق کے پاس لفظ ختم ہو جاتے ہیں۔ تو وہ چومنا شروع کر دیتا ہے۔ اور جب کسی مقرر کے پاس الفاظ کا ذخیرہ

ختم ہو جاتا ہے۔ تو وہ کھانسنے لگتا ہے۔ میں اس کہاوت میں ایک اور چیز شامل کرتا ہوں۔ جب مرد کی مردانگی ختم ہو جاتی ہے۔ تو وہ اپنے ماضی کو پلٹ پلٹ کر دیکھنے لگتا ہے لیکن تم فکر مند نہ ہونا میں اس آخری منزل سے کچھ دُور رہتا ہوں۔ زندگی بہت مصروف اور بھرپور ہے۔ اور بھرپور زندگی میں تم جانتے ہو دیوانگی کے لئے بہت کم فرصت ملتی ہے۔ حالانکہ مجھے اس کی اشد ضرورت محسوس ہوتی ہے۔

تبسم والا فلم (چاندنی رات) قریب قریب نصف مکمل ہو چکا ہے۔ امر ناتھ سے ایک فلم کا کنٹریکٹ کر چکا ہوں۔ ذرا سوچو تو میری ہیروئن کون ہے؟ —— نگار (نگار سلطانہ) میں نے خود اس کا نام تجویز کیا تھا محض یہ معلوم کرنے کے لئے کہ پردے پر ان پرانے جذبات کا اعادہ کیسے لگتا ہے۔ جو کبھی کسی سے حقیقت کی دُنیا میں متعلق رہے ہیں —— پہلے مسرّت تھی، اب محض کاروبار لیکن کیا خیال ہے تمہارا۔ یہ سلسلہ جوش آفریں نہیں رہے گا۔

تاجی، ابھی تک میری زندگی میں ہے۔ نگار بہت ہی اچھی ہے اور اس کا سلوک بے حد نرم و نازک۔ پچھلے دنوں سے رمولا بھی یہاں بمبے میں ہے۔ اس سے ملاقات کرنے پر مجھے معلوم ہؤا۔ کہ وہ ابھی تک اس کمزوری کو جو اس کے دل و دماغ میں میری طرف سے موجود ہے مغلوب نہیں کر سکی۔ چنانچہ اس کے ساتھ بھی سیر و تفریح رہی اولڈ ہوائے میں ان دنوں "فلمیشن" کے فن میں ڈوانس ٹریننگ لے رہا ہوں۔ مگر دوست یہ سارا سلسلہ بہت ہی پیچیدہ ہو گیا ہے بہر حال میں پیچیدہ گیاں پسند کرتا ہوں۔

وہ میرے اندر جو قسمت آزما مہم جو اور آوارہ گرد ہے، ابھی تک کافی طاقت ور ہے۔ میں کسی مخصوص جگہ کا نہیں اور نہ ہی کسی مخصوص جگہ کا ہونا چاہتا ہوں۔ میں لوگوں سے محبت کرتا ہوں۔ اور اُن سے نفرت کرتا ہوں۔ زندگی یونہی گزر جاتی ہے۔ دراصل زندگی ہی ایک ایسی معشوقہ ہے۔ جس سے مجھے محبت ہے، لوگ جائیں جہنم میں!

مجھے مصنف کا نام بھول گیا ہے۔ مگر اس کا ایک جملہ یاد رہ گیا ہے شاید وہ بھی درست نہ ہو۔ مگر مفہوم کچھ اس قسم کا تھا۔ . . . .

وہ لوگوں سے اس قدر محبت کرتا تھا۔ کہ (خود کو محبت کرنے میں) کبھی تنہا محسوس نہیں کرتا تھا۔ لیکن وہ اس طور پر ان سے نفرت کرتا تھا۔ کہ (نفرت کرنے میں خود کو) یکہ و تنہا محسوس کرتا تھا۔" میں اس میں اور کوئی فقرہ شامل نہیں کر سکتا۔

ان دو خطوں میں تاجی کا ذکر آیا ہے۔ خطوط وحدانی میں اتنا تو بتا چکا ہوں کہ یہ ممتاز کی تصغیر ہے۔ ممتاز کون ہے۔ یہ خود شیام بتا چکا ہے۔ کہ وہ اس کی کمزوری ہے سچ پوچھئے تو زگار، رمولا سب اس کی کمزوریاں تھیں۔ عورت دراصل اس کی سب سے بڑی کمزوری تھی۔ اور یہی اس کے کردار کا مضبوط ترین پہلو تھا۔

ممتاز، زیب قریشی ایم۔ اے کی چھوٹی بہن ہے۔ زیب کے ساتھ بمبے گئی۔ تو وہاں ظہور راجہ کے بھاری بھرکم عشق میں پھنس گئی۔ کچھ عرصے کے بعد اس سے اپنا دامن چھڑا کر لاہور آئی، تو شیام کے ساتھ رومانس شروع ہو گیا۔ بمبے میں جب شیام کی مالی حالت درست ہوئی، تو اس نے اپنے ہونے والے بچوں کی خاطر اس سے شادی کر لی۔

شیام کو بچوں سے بہت پیار تھا۔ خاص طور پر خوبصورت بچوں سے خواہ وہ

حد درجہ بدتمیز ہی کیوں نہ ہوں، طہارت و نفاست پسند طبقوں کی نظر میں وہ خود بہت بڑا بدتمیز تھا۔ بعض عورتیں تو اس سے اس کی بدتمیزیوں کی وجہ سے سخت نفرت کرتی تھیں۔ مگر وہ بالکل بے پروا تھا۔ اس نے کبھی ان عورتوں کی خوشنودی کے لئے اپنی عادات سنوارنے کی کوشش نہ کی، اس کا ظاہر و باطن ایک تھا۔" منٹو ——— میری باتیں سن کر یہ ناک بھوں چڑھانے والی سالیاں سب بنتی ہیں ——— میک اپ کی دنیا میں رہتی ہیں۔"

لیکن بعض عورتیں اس کی بدتمیزیوں سے محبت بھی کرتی تھیں، کیونکہ ان میں بستر کی بو نہیں ہوتی تھی۔ شیام ان سے کھلے مذاق کرتا۔ وہ بھی اس سے ایسی باتیں کرتیں، جو مہذب سوسائٹی میں قابلِ ستر پوش سمجھی جاتی تھیں ....... ہونٹوں پر مسکراہٹیں ناچتیں، حلق سے قہقہے اچھلتے۔ ہنستے ہنستے شیام کی آنکھوں میں آنسو آجاتے اور مجھے ایسا محسوس ہوتا کہ دور کونے میں طہارت پسندی نوکیلے کیلوں پر آسن جمائے اپنے گناہ بخشوانے کی رائیگاں کوشش کر رہی ہے۔

شیام سے میری پہلی ملاقات کب اور کہاں ہوئی۔ یہ مجھے بالکل یاد نہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے، کہ میں اس سے ملنے سے پہلے ہی مل چکا تھا۔ ویسے اب سوچتا ہوں تو اتنا یاد آتا ہے۔ کہ بمبئی میں اس سے شروع کی ملاقاتیں شاید لیڈی جمشید جی روڈ پر ہوتی تھیں جہاں میری بہن رہتی تھی۔ "ہائی نسٹ" میں بالائی منزل کے ایک فلیٹ میں ڈائمنڈ رہتی تھی۔ اس کے ہاں شیام کا آنا جانا تھا۔ دو تین مرتبہ غالباً سیڑھیوں میں اس سے ملنا ہوا۔ یہ ملاقاتیں گو رسمی تھیں، لیکن پھر بھی غایت درجہ بے تکلف تھیں۔ کیونکہ شیام نے مجھے خود ہی بتا دیا تھا۔ کہ ڈائمنڈ نام کی عورت جو مسز شیام کہلاتی ہے۔ درحقیقت اس کی بیوی نہیں، لیکن تعلقات کی بنا پر وہ بیوی سے کچھ زیادہ ہی ہے۔ وہ ازدواجی رشتے اور اس کے اشتہار کا بالکل قائل نہیں تھا لیکن جب ایک تکلیف کے سلسلے میں اسے ڈائمنڈ کو ہسپتال داخل کرانا پڑا۔ تو اس

نے رجسٹر میں اس کا نام مسز شیام ہی لکھوایا۔

بہت دیر بعد ڈائمنڈ کے شوہر نے مقدمے بازی کی۔ شیام کو بھی اس میں پھنسایا گیا، لیکن معاملہ رفع دفع ہو گیا۔ اور ڈائمنڈ جو کہ اب فلمی دنیا میں قدم رکھ چکی تھی۔ اور ذہنی جیبیں دیکھ چکی تھی، شیام کی زندگی سے نکل گئی۔ مگر شیام اس کو یاد کرتا تھا۔

مجھے یاد ہے۔ پونے کے ایک باغ میں اس نے مجھے سیر کراتے ہوئے کہا۔ "منٹو۔ ڈائمنڈ گریٹ عورت تھی —— خدا کی قسم جو عورت اسقاط برداشت کر سکتی ہے۔ وہ دنیا کی بڑی سے بڑی صعوبت کا مقابلہ کر سکتی ہے۔" لیکن فوراً ہی اس نے کچھ سوچ کر کہا۔ "یہ کیا بات ہے منٹو —— عورت پھل پھول سے کیوں ڈرتی ہے —— کیا اس لئے کہ یہ گناہ ہوتا ہے؟ مگر یہ گناہ اور ثواب کی بکواس کیا ہے۔ ایک نوٹ اصلی یا جعلی ہو سکتا ہے۔ ایک بچہ حلال کا یا حرام کا نہیں ہو سکتا۔ وہ جھٹکہ یا کلمہ پڑھ کے چھری پھیرنے سے پیدا نہیں ہوتا۔ اس کی پیدائش کا موجب تو وہ عظیم الشان دیوانگی ہے۔ جس کے مرتکب سب سے پہلے باوا آدم اور اماں حوا ہوئے تھے۔ —— آہ، یہ دیوانگی!"

اور وہ دیر تک اپنی مختلف دیوانگیوں کی باتیں کرتا۔

شیام بہت بلند بانگ تھا۔ اس کی ہر بات، اس کی ہر حرکت، اس کی ہر ادا اونچے سروں میں ہوتی تھی۔ اعتدال کا وہ بالکل قائل نہیں تھا۔ محفل میں سنجیدگی و متانت کی ٹوپی پہن کر بیٹھنا اس کے نزدیک مسخرہ پن تھا۔ شغل مے نوشی کے دوران میں خاص طور پر اگر کوئی خاموش ہو جاتا یا فلسفی بن جاتا۔ تو اُسے ناقابلِ بیان کوفت ہوتی۔ اس سے جھنجھلا جاتا کہ بعض اوقات بوتل اور گلاس توڑ پھوڑ کر گالیاں دیتا محفل سے باہر چلا جاتا۔

پونے کا ایک واقعہ ہے۔ شیام اور مسعود پرویز دونو "زبیدہ کاٹیج" میں رہتے تھے۔ ایک کہانی فروخت کرنے کے سلسلے میں مجھے وہاں ٹھیرنا پڑا۔ مسعود طبعاً خاموشی پسند

ہے۔ شراب پی کر وہ اور بھی زیادہ منجمد ہو جاتا۔ ایک دن صبح سے رم کا دور شروع ہوا۔ اس دوران میں کئی آئے اور بہک کر چلے گئے۔ میں، مسعود اور شیام ڈٹے ہوئے تھے۔ شیام بہت خوش تھا۔ اس لئے کہ وہ بہکنے والوں سے مل کر جی بھر کر شور مچاتا رہا تھا۔ مگر شام کے قریب اس کو دفعتاً محسوس ہوا۔ کہ مسعود دن کی تمام ہاؤ ہو سے الگ تھلگ رہا ہے۔ نشے سے چور آنکھوں کو سکیڑ کر اس نے مسعود کی طرف دیکھا اور طنزیہ لہجے میں کہا۔ "کیوں حضرت پرویز ——— کیا آپ نے مرثیہ مکمل فرما لیا ہے۔"

مسعود حسب عادت مسکرا دیا۔ اتنے میں کرشن چندر آ گیا۔ اور شیام کی منجمد مسکراہٹ کے پیدا کردہ اثر کو بھول گیا۔ دو ایک دور چلے۔ تو شیام نے کرشن سے مسعود کے "ناقابل برداشت انجماد" کا ذکر کیا۔ کرشن کی زبان کا تالا کھولنے کے لئے دو دو پیگ کافی تھے۔ چنانچہ مسعود سے مخاطب ہو کر اس نے لعن طعن شروع کر دی۔ "تم کیسے شاعر ہو پرویز ——— صبح سے پی رہے ہو۔ اور تم نے ابھی تک کوئی واہیات بات نہیں کی۔ خدا کی قسم جو شاعر واہیات بکو اس کرنا نہیں جانتا۔ وہ شاعری بھی نہیں کر سکتا۔ مجھے حیرت ہے کہ تم شاعری کیسے کر لیتے ہو۔ میرا خیال ہے تمہاری یہ شاعری یقیناً بکواس ہو گی۔ اور تمہارا پی کر یوں کیسٹر آئل کی بوتل بن جانا تمہاری اصل شاعری ہے۔"

یہ سن کر شیام اس قدر ہنسا کہ اس کی آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو گرنے لگے۔

جب کچھ دیر تک مسعود سے چھیڑ چھاڑ جاری رہی تو وہ اکسا۔ اٹھ کر اس نے ہم سب کے گلاس خالی کر دئے۔ اور کہا۔ "چلو باہر چلیں۔"

ہم باہر نکلے۔ مسعود کے کہنے پر سب نے اپنے جوتے اتار کر جیبوں میں رکھ لئے اور دوڑنے لگے۔ اس وقت رات کے بارہ بجے ہوں گے۔ پونہ کی سڑکیں سب سنسان تھیں۔ میں مسعود، شیام اور ایک اور جس کا نام مجھے یاد نہیں رہا۔ دیوانہ وار شور مچاتے

دَوڑ رہے تھے۔ بالکل بے مطلب! اپنی منزل سے نا آشنا۔

راستے میں کرشن چندر کا مکان پڑتا تھا۔ وہ دَوڑ سے پہلے ہم سے الگ ہو کر چلا گیا تھا۔ دروازہ کھلوا کر ہم نے اُسے بہت پریشان کیا۔ اس کی نمینہ خاتون ہمارا شور سُن کر دوسرے کمرے سے باہر نکل آئی۔ اس سے کرشن اور بھی زیادہ پریشان ہُوا جس کے پیشِ نظر ہم وہاں سے رخصت ہوئے اور پھر سڑک پیمائی شروع کر دی۔

پُونہ مندروں کا شہر ہے۔ ہر فرلانگ پہ ایک نہ ایک مندر ضرور ہوتا ہے۔ مسعود نے ایک کا گھنٹہ بجایا۔ مَیں اور شیام سجدے میں چلے گئے اور شو شمبھو، شو شمبھو کہنے لگے۔ اس کے بعد جو بھی مندر آتا۔ ہم چاروں یہی عمل دہراتے رہے اور خوب قہقہے لگاتے جب کوئی پجاری آنکھیں ملتا باہر نکلتا۔ تو ہم خاموش ہو جاتے اور چپ چاپ چل پڑتے اسی طرح تین بج گئے —— ایک سڑک میں کھڑے ہو کر مسعود نے وہ مغلظات بکیں کہ مَیں دنگ رہ گیا۔ کیونکہ اس کی زبان سے مَیں نے کبھی ناشائستہ کلمہ نہیں سُنا تھا۔ مگر جب وہ موٹی موٹی گالیاں اُگل رہا تھا۔ تو مَیں نے محسوس کیا۔ کہ وہ اس کی زبان پر ٹھیک طور پر بیٹھتی نہیں تھیں۔

چار بجے ہم زبیدہ کاٹیج پہنچے اور سو گئے۔ لیکن مسعود شاید جاگتا اور شعر کہتا رہا تھا۔

مے نوشی کے معاملے میں بھی شیام اعتدال پسند نہیں تھا۔ وہ کھل کھیلنے کا قائل تھا۔ مگر اپنے سامنے میدان کی وسعت دیکھ لیتا تھا۔ اس کی لمبائی چوڑائی کو اچھی طرح جانچ لیتا تھا۔ تاکہ حدود سے آگے نہ نکل جائے۔ وہ مجھ سے کہا کرتا تھا "مَیں چوکے پسند کرتا ہوں —— چھکّے محض اتفاق سے لگ جاتے ہیں"۔

ایک چھکّا ملاحظہ ہو:۔

تقسیم ہونے سے چند ماہ بیشتر کا ذکر ہے —— شیام شاہد لطیف کے گھر

سے میرے یہاں چلا آیا تھا۔ بمبئی کی زبان میں کڑکی یعنی مفلسی کے دن تھے۔ مگر مے نوشی بڑی باقاعدگی سے جاری تھی۔ ایک شام باتوں باتوں میں زیادہ پی گئے۔ راجہ مہدی علی خان بھی اتفاق سے موجود تھا۔ کرفیو کا وقت ہوا۔ تو اُس نے جانے کی اجازت چاہی۔

مَیں نے اُس سے کہا۔ "پاگل ہوئے ہو پکڑے جاؤ گے۔"

شیام نے اُس سے ازراہِ مذاق کہا۔ "یہیں سو جاؤ۔ آج کل تاجی یہاں نہیں ہے۔ راجہ نے مُسکرا کر جواب دیا۔ "مجھے نیند نہیں آئے گی۔ سپرنگ والے پلنگوں پر میں قطعاً نہیں سو سکتا۔"

شیام نے ایک گلاس میں راجہ کے ڈیل ڈول کے مطابق برانڈی کا پیگ ڈالا اور اس کو دے دیا۔ "یہ لو۔ اس سے نیند آ جائے گی۔"

راجہ ایک جرعے میں سارا گلاس چڑھا گیا۔ بہت دیر تک تاجی کی باتیں ہوتی رہیں۔ جو شیام سے ناراض ہو کر اپنی بہن کے پاس چلی گئی تھی ـــ ہر آٹھویں دسویں روز نکمّی نکمّی باتوں پر دونوں میں تخ ہو جاتی تھی۔ مَیں بالکل دخل نہیں دیتا تھا۔ اس لئے کہ شیام کو یہ بالکل پسند نہ تھا۔ ہم دونوں میں، گویا دل ہی دل میں یہ معاہدہ ہو چکا تھا۔ کہ ایک دوسرے کے کاموں میں دخل اندازی نہیں کریں گے۔

تاجی یوں گئی تھی۔ جیسے کبھی واپس نہیں آئے گی۔ اور شیام نے بھی اُسے یوں وداع کیا تھا۔ جیسے وہ پھر کبھی اس کی شکل تک دیکھنے کا روادار نہیں ہوگا۔ مگر دونو ایک دوسرے سے دُور بیٹھے تڑپتے رہتے تھے۔ شاموں کو تو شیام اکثر تاجی کے معاملے میں بہت جذباتی ہو جاتا تھا۔ میں سوچتا کہ وہ ضرور رات بھر اُس کی یاد میں جاگتا رہے گا۔ مگر کم بخت نیند کا کچھ ایسا ماتا تھا۔ کہ پلنگ پر لیٹتے ہی سو جاتا۔

میرے فلیٹ میں صرف دو کمرے تھے۔ ایک سونے کا دوسرا بیٹھنے کا۔ سونے والا کمرہ میں نے شیام اور تاجی کو دے دیا تھا۔ اور بیٹھنے والے کمرے میں گدا

بچھا کر میں سوتا تھا۔ تاجی چونکہ موجود نہیں تھی۔ اس لئے اس کا پلنگ راجہ مہدی علیخاں کو مل گیا۔ رات بہت گذر گئی تھی۔ اس لئے ہم سب اپنی، اپنی جگہ پر سو گئے۔

حسبِ معمول پونے چھ کے قریب میری جاگ کھلی۔ نیم خوابی کے عالم میں یوں محسوس ہوا۔ کہ میرے ساتھ کوئی لیٹا ہے۔ پہلے میں نے خیال کیا۔ کہ بیوی ہے، مگر وہ تو لاہور بیٹھی تھی۔ آنکھیں کھول کر دیکھا۔ تو معلوم ہوا کہ شیام ہے۔ اب میں نے سوچنا شروع کیا۔ کہ یہ کیسے میرے پاس پہنچ گیا۔ ابھی یہ سوچ ہی رہا تھا۔ کہ جلے ہوئے کپڑے کی بُو ناک میں گھسی۔ پاس ہی صوفہ پڑا تھا۔ عرصہ ہوا سگرٹ گرنے سے اس کا ایک حصّہ جل گیا تھا۔ مگر اتنی دیر کے بعد اب بُو آنے کا کیا مطلب ہے۔ آنکھیں زیادہ کھلیں۔ تو میں نے دھوئیں کی کڑواہٹ محسوس کی۔ اور ہلکے ہلکے دودھیا بادل بھی دیکھے ——— اُٹھ کر میں دوسرے کمرے میں گیا۔ کیا دیکھتا ہوں۔ کہ وہ پلنگ جس پر شیام سویا کرتا تھا۔ سُلگ رہا ہے۔ اور پاس ہی دوسرے پلنگ پر راجہ مہدی علی خاں اپنی توند نکالے پڑا خراٹے لے رہا ہے۔

میں نے قریب جا کر پلنگ کے جلے ہوئے حصّہ کا معائنہ کیا۔ میٹرس میں بڑی رکابی کے برابر سوراخ تھا۔ جس میں سے دھواں نکل رہا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا۔ کہ کسی نے آگ بجھانے کی کوشش کی ہے۔ کیونکہ پلنگ پانی میں تر بتر تھا۔ مگر معاملہ چونکہ روئی اور ناریل کے مُچھوں کا تھا۔ اس لئے آگ پوری طرح بجھی نہیں تھی۔ اور برابر سُلگ رہی تھی۔ میں نے راجہ کو جگانے کی کوشش کی۔ مگر وہ کروٹ بدل کر اور زور سے خراٹے لینے لگا۔ ایک دم پلنگ کے سیاہ سوراخ سے ایک لال لال شعلہ باہر لپکا۔ میں فوراً غسل خانے کی طرف بھاگا۔ ایک بالٹی پانی کی اس سوراخ میں ڈالی۔ اور جب پوری طرح اطمینان ہوگیا۔ کہ آگ بجھ گئی ہے۔ تو راجہ کو جھنجھوڑ جھنجھوڑ کر جگایا۔ اس سے جب آتشزدگی کی واردات کے متعلق استفسار کیا۔ تو اُس نے اپنے

مخصوص مزاحیہ انداز میں خوب نمک۔ مرچ لگا کر واقعات بیان کیئے۔ "تمھارا یہ
شیام ہنومان مہاراج ہے۔ رات برانڈی کے تالاب میں غوطہ لگاتے ہوئے میں
سو گیا۔ دو بجے کے قریب جب عجیب عجیب آوازیں آئیں۔ تو میں جاگ پڑا۔
کیا دیکھتا ہوں۔ کہ شیام ایک بہت بڑا ہنومان ہے۔ اُس کی پیچھے والی دُم کے
سامنے مٹی کے تیل میں ڈوبی جھنڈیاں بندھی ہیں۔ اور اُن میں آگ لگی ہے۔ شیام
پلنگ پر زور زور سے اُچھل کود رہا تھا۔ اور اپنی دُم سے آگ لگا رہا ہے۔
جب آگ لگ گئی۔ تو میں نے آنکھیں بند کر لیں۔ اور برانڈی کے تالاب میں غوطہ
لگا گیا۔ تہہ کے ساتھ لگ کر سونے ہی والا تھا۔ کہ مجھے تمہارا خیال آیا ہے۔
کہ غریب آدمی کا پلنگ ایسا نہ ہو کہ جل کر راکھ ہو جائے۔ چنانچہ اُٹھا۔ شیام غائب
تھا۔ دوسرے کمرے میں تمھیں حالات سے آگاہ کرنے کے لئے گیا۔ تو کیا دیکھتا
ہوں۔ کہ شیام اپنے اصلی روپ میں تمھارے ساتھ چمٹ کر لیٹا ہے۔ میں نے
تمھیں جگانے کی کوشش کی۔ اپنے پھیپھڑوں پر زور لگا لگا کر تمھیں پکارا۔ گھنٹے
بجائے۔ ایٹم بم چلائے۔ مگر تم نہ اُٹھے۔ آخر میں نے ہولے ہولے تمہارے کان
میں کہا۔ خواجہ اُٹھو۔ اسکاچ وسکی کی ایک پوری پیٹی آئی ہے۔ تم نے فوراً آنکھیں
کھول دیں۔ اور پوچھا کہاں" —— میں نے کہا۔ ہوش میں آؤ —— سارا مکان
جل رہا ہے —— آگ لگ گئی ہے آگ! تم نے کہا "بکتے ہو۔" میں نے کہا "نہیں
خواجہ۔ میں خواجہ خضر کی قسم کھا کر کہتا ہوں۔ آگ لگی ہے۔" جب تمھیں میرے بیان
پر یقین آگیا۔ تو تم آرام سے یہ کہتے ہوئے سو گئے۔ فائر بریگیڈ کو اطلاع دے دو"
تمھاری طرف سے مایوس ہو کر میں نے شیام کو حالات کی نزاکت سے آگاہ کرنے
کی کوشش کی۔ جب وہ اس قابل ہوا کہ میری بات اس کے دماغ تک پہنچ سکے۔
تو اس نے مجھ سے کہا۔ "تم بجھا دو نا یار۔ کیوں تنگ کرتے ہو" اور سو گیا۔۔۔۔۔۔

آگ آخر آگ ہے اور اُس کا بجھانا ہر انسان کا فرض ہے۔ اس لئے میں فوراً اپنی ساری انسانیت مجتمع کر کے فائر بریگیڈ بن گیا۔ اور وہ جگ جو میں نے تمھاری سالگرہ پر تحفے کے طور پہ دیا تھا۔ بھر کے آگ پر ڈال دیا ـــــ میرا کام چونکہ پورا ہو چکا تھا۔ نتیجہ خدا کے ہاتھ سونپ کر سو گیا۔"

شیام جب پوری نیند سو کر اُٹھا۔ تو میں نے اور راجہ نے اس سے پوچھا۔ کہ آگ کیسے لگی تھی۔ شیام کو یہ قطعاً معلوم نہیں تھا۔ بہت دیر غور و فکر کے بعد اُس نے کہا۔ "میں آتشزدگی کی اس واردات پر کوئی روشنی نہیں ڈال سکتا"۔ مگر جب راجہ دوسرے کمرے سے شیام کی جلی ہوئی ریشمی قمیض اٹھا کر لایا۔ تو شیام نے مجھ سے کہا۔ "اب تفتیش کرنی ہی پڑے گی"۔

سب نے مل کر تفتیش کی تو معلوم ہوا۔ کہ شیام صاحب نے جو بنیان پہنا تھا۔ وہ بھی دو ایک جگہ سے جلا ہوا ہے۔ زیادہ گہرائیوں میں گئے تو دیکھا۔ کہ ان کی چھاتی پر روپے روپے جتنے دو بڑے آبلے ہیں۔ چنانچہ شرلک ہومز نے اپنے دوست واٹسن سے کہا۔ "یہ بات قطعی طور پہ پایۂ ثبوت کو پہنچ گئی ہے۔ کہ آگ ضرور لگی تھی۔ اور شیام صرف اس غرض سے کہ اس کے ہمسائے راجہ مہدی علی خاں کو تکلیف نہ ہو چپ چاپ اُٹھ کر میرے پاس چلا آیا۔"

جب شیام نے تہذیب و تمدن کے مروّجہ قوانین کے پیشِ نظر تاجی سے باقاعدہ شادی کی۔ تو میرا خیال ہے۔ صرف ایک انتقامی جذبے کے تحت اُس نے اتنی شاندار دعوت کی۔ کہ دیر تک مسلمی دنیا میں اس کے چرچے رہے۔ اتنی شراب بہائی گئی۔ کہ خم کے خم خالی ہو گئے۔ مگر افسوس کہ تہذیب و تمدن کی ستر پوش چولی کے داغ دھل نہ سکے۔

شیام صرف بوتل اور عورت ہی کا رسیا نہیں تھا۔ زندگی میں جتنی نعمتیں موجود

ہیں۔ وہ ان سب کا عاشق تھا۔ اپنی کتاب سے بھی وہ اسی طرح پیار کرتا تھا۔ جس طرح ایک اچھی عورت سے کرتا تھا۔ اس کی ماں اس کے بچپن ہی میں مر گئی تھی۔ مگر اس کو اپنی سوتیلی ماں سے بھی ویسی ہی محبت تھی۔ جو حقیقی ماں سے ہو سکتی تھی۔ اس کے چھوٹے چھوٹے سوتیلے بہن بھائی تھے۔ ان سب کو وہ اپنی جان سے زیادہ عزیز سمجھتا تھا۔ باپ کی موت کے بعد صرف اس کی اکیلی جان تھی۔ جو اتنے بڑے کنبہ کی دیکھ بھال کرتی تھی۔

ایک عرصے تک وہ انتہائی خلوص کے ساتھ دولت اور شہرت حاصل کرنے کے لئے ہاتھ پاؤں مارتا رہا۔ اس دوران میں تقدیر نے اُسے کئی غچے دئے۔ مگر وہ ہنستا رہا۔ "جانِ من ایک دن ایسا بھی آئے گا۔ کہ تو میری بغل میں ہو گی۔" اور وہ کئی برسوں کے بعد آخر کہہ ہی گیا۔ کہ دولت اور شہرت دونوں اس کی جیب میں تھیں۔

موت سے پہلے اُس کی آمدنی ہزاروں روپے ماہوار تھی۔ بمبے کے مضافات میں ایک خوبصورت بنگلہ اس کی ملکیت تھا۔ اور کبھی وہ دن تھے۔ کہ اس کے پاس سر چھپانے کو جگہ نہیں تھی۔ مگر مفلسی کے ان ایام میں بھی وہی ہنستا ہوا شیام تھا۔ دولت و شہرت آئی۔ تو اس نے ان کا یوں استقبال نہ کیا۔ جس طرح لوگ ڈپٹی کمشنر کا کرتے ہیں۔ یہ دونوں محترمائیں اس کے پاس آئیں۔ تو اس نے ان کو اپنی لوہے کی چارپائی پر بٹھا لیا۔ اور پٹاخ پٹاخ بوسے داغ دئے۔

میں اور وہ جب ایک چھت کے نیچے رہتے تھے۔ تو دونوں کی حالت پتلی تھی۔ فلم انڈسٹری ملک کی سیاسیات کی طرح ایک بڑے ہی نازک دور سے گذر رہی تھی۔ میں بمبئی ٹاکیز میں ملازم تھا۔ اس کا وہاں ایک پکچر کا کنٹریکٹ تھا۔ دس ہزار روپے میں عرصے کی بیکاری کے بعد اس کو یہ کام ملا تھا۔ مگر وقت پر

پیسے نہیں ملتے تھے۔ بہرحال ہم دونوں کا گذر کسی نہ کسی طور ہو جاتا تھا میاں بیوی ہوتے تو اُن میں روپے پیسے کے معاملے میں ضرور رنج ہوتی۔ مگر شیام اور مجھے کبھی محسوس تک نہ ہوا۔ کہ ہم میں سے کون خرچ کر رہا ہے، اور کتنا کر رہا ہے۔

ایک دن اُسے بڑی کوششوں کے بعد موٹی سی رقم ملی۔ غالباً پانچسو روپے تھے۔ میری جیب خالی تھی۔ ہم ملاد سے گھر آ رہے تھے۔ راستے میں شیام کا یہ پروگرام بن گیا۔ کہ وہ چرچ گیٹ کسی دوست سے ملنے جائے گا۔ میرا اسٹیشن آیا۔ تو اُس نے جیب سے دس دس روپے کے نوٹوں کی گڈی نکالی۔ آنکھیں بند کر کے اس کے دو حصّے کئے اور مجھ سے کہا۔ "جلدی کرو فٹو — ان میں سے ایک لے لو۔"

مَیں نے گڈی کا ایک حصّہ پکڑ کر جیب میں ڈال لیا۔ اور پلیٹ فارم پر اُتر گیا۔ شیام نے مجھے "ٹاٹا" کہا۔ اور کچھ نوٹ جیب سے نکال کر لہرائے۔ "تم بھی کیا یاد رکھو گے سیفٹی کی خاطر میں نے یہ نوٹ علیحدہ رکھ لئے تھے — ہپ ٹلا!"

شام کو جب وہ اپنے دوست سے مل کر آیا۔ تو کباب ہو رہا تھا۔ مشہور فلم اسٹار "کے کے" نے اس کو بلایا تھا۔ کہ وہ اس سے ایک پرائیویٹ بات کرنا چاہتی ہے۔ شیام نے برانڈی کی بوتل بغل میں سے نکال کر اور ایک گلاس میں ایک بڑا پیگ ڈال کر مجھ سے کہا: "پرائیویٹ بات یہ تھی..... میں نے لاہور میں ایک دفعہ کسی سے کہا تھا۔ کہ "کے کے" مجھ پر مرتی ہے۔ خدا کی قسم بہت بُری طرح مرتی تھی۔ لیکن ان دنوں میرے دل میں کوئی گنجائش نہیں تھی۔ آج اُس نے مجھے اپنے گھر بُلا کر کہا۔ کہ تم نے بکواس کی تھی۔ مَیں تم پر کبھی نہیں مری۔ مَیں نے کہا تو آج مر جاؤ۔ مگر اس نے ہٹ دھرمی سے کام لیا۔ اور مجھے غصّے میں آ کر اُس کے ایک گھونسہ مارنا پڑا۔"

میں نے اس سے پوچھا۔ "تم نے ایک عورت پر ہاتھ اُٹھایا۔"

شیام نے مجھے اپنا ہاتھ دکھایا۔ جو زخمی ہو رہا تھا۔ "کم بخت آگے سے ہٹ گئی۔ نشانہ چوکا اور میرا گھونسہ دیوار کے ساتھ جا ٹکرایا۔"

یہ کہہ کر وہ خوب ہنسا۔ "سالی بیکار تنگ کر رہی ہے۔"

میں نے اوپر روپے پیسے کا ذکر کیا ہے ـــــ غالباً دو برس پیچھے کی بات ہے۔ میں یہاں لاہور میں فلمی صنعت کی زبوں حالی اور اپنے افسانے "ٹھنڈا گوشت" کے مقدمے کی وجہ سے بہت پریشان تھا۔ عدالتِ ماتحت نے مجھے مجرم قرار دے کر تین مہینے قید با مشقت اور تین سو جرمانے کی سزا دی تھی۔ میرا دل اس قدر کھٹا ہو گیا تھا۔ کہ جی چاہتا تھا۔ اپنی تمام تصانیف کو آگ میں جھونک کر کوئی اور کام شروع کر دوں جس کا تخلیق سے کوئی علاقہ ہو ـــــ چنگی کے محکمے میں ملازم ہو جاؤں۔ اور رشوت کھا کر اپنا اور اپنے بال بچوں کا پیٹ پالا کروں۔ کسی پر نکتہ چینی کروں نہ کسی معاملے میں اپنی رائے دوں۔

ایک عجیب و غریب دَور سے میرا دل و دماغ گذر رہا تھا۔ بعض لوگ سمجھتے تھے۔ کہ افسانے لکھ کر ان پر مقدمے چلوانا میرا پیشہ ہے۔ بعض کہتے تھے۔ کہ میں صرف اس لئے لکھتا ہوں۔ کہ مجھے شہرت کا دلدادہ ہوں۔ اور لوگوں کے سفلی جذبات مشتعل کر کے اپنا الّو سیدھا کرتا ہوں۔ مجھ پر چار مقدمے چل چکے ہیں۔ ان چار الّوؤں کو سیدھا کرنے میں جو خرچ میری کمر میں پیدا ہوا۔ اس کو کچھ میں ہی جانتا ہوں۔

مالی حالت کچھ پہلے ہی کمزور تھی۔ اس پاس کے ماحول نے جب نکما کر دیا۔ تو آمدنی کے محدود ذرائع اور بھی سکڑ گئے۔ ایک صرف مکتبہ جدید لاہور کے چودھری برادران تھے۔ جو متواتر برابر میری امداد کر رہے تھے۔ غم غلط کرنے کے لئے جب میں نے کثرت سے شراب نوشی شروع کی۔ تو انھوں نے چاہا کہ اپنا ہاتھ روک لیں۔ مگر وہ اتنے مخلص تھے۔ کہ مجھے ناراض کرنا نہیں چاہتے تھے۔

اس زمانے میں میری کسی سے خط و کتابت نہیں تھی۔ دراصل میرا دل بالکل اچاٹ ہو چکا تھا۔ اکثر گھر سے باہر رہتا۔ اور اپنے شرابی دوستوں کے گھر پڑا رہتا۔ جن کا ادب سے دور کا بھی واسطہ نہیں تھا۔ ان کی صحبت میں رہ کر میں جسمانی و روحانی خودکشی کی کوشش میں مصروف تھا۔

ایک دن مجھے کسی اور کے گھر کے پتے سے ایک خط ملا۔ تحسین پکچرز کے مالک کی طرف سے تھا۔ لکھا تھا۔ کہ میں فوراً ملوں۔ بمبے سے انہیں میرے بارے میں کوئی ہدایت موصول ہوئی ہے۔ صرف یہ معلوم کرنے کے لئے کہ یہ ہدایت بھیجنے والا کون ہے۔ میں تحسین پکچرز والوں سے ملا۔ معلوم ہوا کہ بمبئے کے شیام کے پے در پے انھیں کئی تار ملے ہیں۔ کہ مجھے ڈھونڈھ کر ۵۰۰ روپے دے دیئے جائیں۔ میں جب دفتر میں پہنچا۔ تو وہ شیام کے تازہ تاکیدی تار کا جواب لکھ رہے تھے۔ کہ تلاشِ بسیار کے باوجود انھیں منٹو نہیں مل سکا۔

میں نے ۵۰۰ روپے لے لئے اور میری مخمور آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

میں نے بہت کوشش کی۔ کہ شیام کو خط لکھ کر اس کا شکریہ ادا کروں اور پوچھوں کہ اس نے مجھے یہ ۵۰۰ روپے کیوں بھیجے تھے۔ کیا اس کو علم تھا۔ کہ میری مالی حالت کمزور ہے۔ اس غرض سے میں نے کئی خط لکھے اور پھاڑ دیئے۔ ایسا محسوس ہوتا کہ میرے لکھے ہوئے الفاظ شیام کے اس جذبے کا منہ چڑا رہے ہیں جس کے زیرِ اثر اس نے مجھے یہ روپے روانہ کئے تھے۔

پچھلے سال جب شیام اپنے ذاتی فلم کی نمائش کے سلسلے میں امرتسر آیا۔ تو تھوڑی دیر کے لئے لاہور بھی آ گیا۔ یہاں اس نے بہت سے لوگوں سے میرا اتا پتا پوچھا۔ مگر اس دوران میں اتفاق سے مجھے ہی معلوم ہو گیا۔ کہ وہ لاہور میں موجود ہے، میں اسی وقت دوڑا اس سینما پہنچا۔ جہاں وہ ایک دعوت کھا کے

آ رہا تھا۔

میرے ساتھ رشید عطرے تھا۔ شیام کا پُونے کا پرانا دوست۔ جب موٹر سینما کے صحن میں داخل ہوئی تو شیام نے مجھے اور رشید کو دیکھ لیا۔ ایک زور کا نعرہ اُس نے بلند کیا۔ اُس نے ڈرائیور سے موٹر روکنے کے لیئے بہت کہا۔ مگر اس کے استقبال کے لیئے اس قدر ہجوم تھا۔ کہ ڈرائیور نہ رُکا۔ موٹر سے نکل کر پولیس کی مدد سے شیام اور ادم ایک ہی قسم کا لباس اور سر پر سفید پانامہ ہیٹ پہنے سینما کے اندر پچھلے دروازے سے داخل ہوئے۔ بڑے دروازے سے ہم اندر پہنچے۔ شیام ـــــ وہی شیام تھا۔ مُسکراتا، ہنستا اور قہقے لگاتا شیام۔

دوڑ کر ہم دونوں اس سے لپٹ گئے۔ پھر اس قدر شور مچا۔ کہ ہم میں سے کوئی بھی مطلب کی بات نہ کر سکا۔ اُوپر تلے اتنی باتیں ہوئیں کہ انبار لگ گئے۔ اور ہم ان کے نیچے دب کر رہ گئے۔ سینما سے فارغ ہو کر اُسے ایک فلم ڈسٹری بیوٹر کے دفتر میں جانا تھا۔ ہمیں بھی اپنے ساتھ لے گیا۔ یہاں جو بات بھی شروع ہوتی۔ فوراً ہی کٹ جاتی۔ لوگ دھڑا دھڑ آ رہے تھے۔ نیچے بازار میں ہجوم شور برپا کر رہا تھا۔ کہ شیام درشن دینے کے لیئے باہر بلکنی میں آئے۔

شیام کی حالت عجیب و غریب تھی۔ اس کو لاہور میں اپنی موجودگی کا شدید احساس تھا۔ اس لاہور میں جس کی متعدد سڑکوں پر اُس کے رومانوں کے چھینٹے بکھرا کرتے تھے۔ اس لاہور میں جس کا فاصلہ اب امرت سر سے ہزاروں میل ہو گیا تھا۔ اور اس کا راولپنڈی کہاں تھا۔ جہاں اُس نے اپنے لڑکپن کے دن گذارے تھے، لاہور، امرت سر، اور راولپنڈی سب اپنی اپنی جگہ پر تھے۔ مگر وہ دن نہیں تھے۔ وہ راتیں نہیں تھیں۔ جو شیام یہاں چھوڑ کر گیا تھا۔ سیاست کے گورکن نے انھیں نہ معلوم کہاں دفن کر دیا تھا۔

شیام نے مجھ سے کہا۔ میرے ساتھ ساتھ رہو مگر اس کے دل و دماغ کی مضطرب کیفیت کے احساس نے مجھے سخت پراگندہ کر دیا۔ اُس سے یہ وعدہ کر کے کہ رات کو اس سے فلیٹی ہوٹل میں ملوں گا۔ چلا گیا۔

شیام سے اتنی دیر کے بعد ملاقات ہوئی تھی۔ مگر خوشی کے بجائے ایک عجیب قسم کی گھٹی گھٹی کوفت محسوس ہو رہی تھی۔ طبیعت میں اس قدر جھنجلاہٹ تھی۔ کہ جی چاہتا تھا۔ کسی سے زبردست لڑائی ہو جائے۔ خوب مار کٹائی ہو اور میں تھک کر سو جاؤں۔ گھٹن کا تجزیہ کیا تو کہاں کا کہاں پہنچ گیا۔ ایک ایسی جگہ جہاں خیالات کے سارے دھاگے بُری طرح آپس میں اُلجھ گئے۔ اس سے طبیعت اور بھی جھنجلا گئی۔ اور فلیٹیز میں جا کر میں نے ایک دوست کے کمرے میں پینا شروع کر دی۔

نو ساڑھے نو کے قریب شور سُننے پر معلوم ہوا کہ شیام آگیا ہے، اس کے کمرے میں ملنے والوں کی ویسی ہی بھیڑ تھی۔ تھوڑی دیر وہاں بیٹھا۔ مگر کھُل کر کوئی بات نہ ہوئی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا۔ کہ ہم دونوں کے جذبات میں تالے لگا کر چابیاں کسی نے ایک بہت بڑے گچھے میں پرو دی تھیں۔ ہم دونوں اس گچھے میں سے ایک ایک چابی نکال کر یہ تالے کھولنے کی کوشش کرتے اور ناکام رہتے تھے۔

میں اُکتا گیا۔ ڈنر کے بعد شیام نے بڑی جذباتی قسم کی تقریر کی۔ مگر میں نے اس کا ایک لفظ تک نہ سُنا۔ میرا اپنا دماغ بڑے اُونچے سُروں میں جانے کیا بک رہا تھا۔ شیام نے اپنی بکواس ختم کی۔ تو لوگوں نے بھرے پیٹ کے ساتھ تالیاں پیٹیں۔ میں اُٹھ کر کمرے میں چلا آیا۔ وہاں فضلی بیٹھے تھے۔ ان سے ایک معمولی بات پر تُو تُو مَیں مَیں ہو گئی۔ شیام آیا تو اس نے کہا: "یہ سب لوگ ہیرا منڈی جا رہے ہیں چلو آؤ

تم بھی چلو۔"

میں قریب قریب رو دیا۔ "میں نہیں جاتا۔ تم جاؤ اور تمہارے یہ لوگ جائیں۔"

"تو میرا انتظار کرو ـــــ میں ابھی آیا۔"

یہ کہہ کر شیام ہیرا منڈی جانے والی پارٹی کے ساتھ چلا گیا۔ میں نے شیام کو اور فلمی صنعت سے متعلق تمام لوگوں کو موٹی موٹی گالیاں دیں۔ اور فضلی سے کہا۔

"میرا خیال ہے۔ آپ یہاں انتظار کریں گے۔ اگر تکلیف نہ ہو۔ تو ازراہ کرم اپنی موٹر میں مجھے میرے گھر تک چھوڑ آیئے۔"

رات بھر اوٹ پٹانگ خواب دیکھتا رہا۔ شیام سے کئی مرتبہ لڑائی ہوئی۔ صبح دودھ والا آیا۔ تو میں کھوکھلے غصے میں اس سے کہہ رہا تھا۔ "تم بالکل بدل گئے ہو..... الو کے پٹھے، کمینے، ذلیل..... تم ہندو ہو۔"

نیند کھلی تو میں نے محسوس کیا۔ کہ میرے منہ سے ایک بہت بڑی گالی نکل گئی ہے۔ لیکن جب میں نے خود کو اچھی طرح ٹٹولا۔ تو یقین ہو گیا۔ کہ وہ میرا منہ نہیں تھا۔ سیاست کا بھونپو تھا جس سے یہ گالی نکلی تھی۔ اس کے متعلق سوچتے ہوئے میں نے دودھ والے سے دودھ لیا۔ جس میں ایک چوتھائی پانی تھا۔ اس خیال نے مجھے بڑی ڈھارس دی۔ کہ شیام ہندو تھا۔ مگر پانی ملا ہندو نہیں تھا۔

عرصہ ہوا جب تقسیم پر ہندو مسلمانوں میں خونریز جنگ جاری تھی۔ اور طرفین کے ہزاروں آدمی روزانہ مرتے تھے۔ شیام اور میں راولپنڈی سے بھاگے ہوئے ایک سکھ خاندان کے پاس بیٹھے تھے۔ اس کے افراد اپنے تازہ زخموں کی روداد سنا رہے تھے۔ جو بہت ہی دردناک تھی۔ شیام متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔ وہ ہلچل جو اس کے دل و دماغ میں مچ رہی تھی۔ اس کو میں بخوبی سمجھتا تھا۔ جب ہم وہاں سے رخصت ہوئے تو میں نے شیام سے کہا۔ "میں مسلمان ہوں، کیا تمہارا جی نہیں

چاہتا کہ مجھے قتل کر دو۔"

شیام نے بڑی سنجیدگی سے جواب دیا۔ "اس وقت نہیں ——— لیکن اس وقت جبکہ میں مسلمانوں کے ڈھائے ہوئے مظالم کی داستان سن رہا تھا ——— میں تمھیں قتل کر سکتا تھا۔"

شیام کے منہ سے یہ سن کر میرے دل کو زبردست دھکا لگا۔ اس وقت شاید میں بھی اُسے قتل کر سکتا۔ مگر بعد میں جب میں نے سوچا۔ اور اُس وقت اور اس وقت میں زمین و آسمان کا فرق محسوس کیا۔ تو ان تمام فسادات کا نفسیاتی پس منظر میری سمجھ میں آگیا۔ جس میں روزانہ سینکڑوں بے گناہ ہندو اور مسلمان موت کے گھاٹ اتارے جا رہے تھے۔

اس وقت نہیں ——— اُس وقت ہاں..... کیوں؟ آپ سوچئے تو آپ کو اس کیوں کے پیچھے انسان کی فطرت میں اس سوال کا صحیح جواب مل جائیگا۔

بمبئی میں بھی فرقہ وارانہ کشیدگی دن بدن بڑھتی چلی جا رہی تھی۔ بمبے ٹاکیز کی عنانِ حکومت جب اشوک اور واچا نے سنبھالی۔ تو بڑے بڑے عہدے اتفاق سے مسلمانوں کے ہاتھ میں چلے گئے۔ اس سے بمبے ٹاکیز کے ہندو اسٹاف میں نفرت اور غصّے کی لہر دوڑ گئی۔ واچا کو گمنام خط موصول ہونے لگے جس میں اسٹوڈیو کو آگ لگانے اور مرنے مارنے کی دھمکیاں ہوتی تھیں۔ اشوک اور واچا دونوں کو ان کی کوئی پروا نہیں تھی۔ لیکن کچھ ذکی الحس ہونے کے باعث اور کچھ مسلمان ہونے کی وجہ سے میں حالات کی نزاکت کو بہت زیادہ اہمیت دے رہا تھا۔ کئی مرتبہ میں نے اشوک اور واچا سے اپنی تشویش کا اظہار کیا۔ اور اُن کو رائے دی۔ کہ وہ مجھے بمبے ٹاکیز سے الگ کر دیں۔ کیونکہ ہندو یہ سمجھتے تھے۔ کہ صرف میری وجہ سے مسلمان وہاں داخل ہو رہے ہیں۔ مگر انہوں نے کہا۔ کہ میرا دماغ خراب ہے۔

دماغ میرا واقعی خراب ہو رہا تھا۔ بیوی بچے پاکستان میں تھے۔ جب وہ ہندوستان کا ایک حصّہ تھا۔ تو میں اُسے جانتا تھا۔ اس میں وقتاً فوقتاً جو ہندو مسلم فسادات ہوتے رہتے تھے۔ میں ان سے بھی واقف تھا۔ مگر اب اس خطۂ زمین کو نئے نام نے کیا بنا دیا تھا۔ اس کا مجھے علم نہیں تھا۔ اپنی حکومت کیا ہوتی ہے؟ اس کی تصویر بھی کوشش کے باوجود میرے ذہن میں نہیں آتی تھی۔

۱۴ اگست کا دن میرے سامنے بمبے میں منایا گیا۔ پاکستان اور ہندوستان دونوں آزاد ملک قرار دیئے گئے تھے۔ لوگ مسرور تھے۔ مگر قتل اور آگ کی وارداتیں باقاعدہ جاری تھیں۔ ہندوستان زندہ باد کے ساتھ ساتھ پاکستان زندہ باد کے نعرے بھی لگتے تھے۔ کانگرس کے ترنگے کے ساتھ اسلامی پرچم بھی لہراتا تھا۔ پنڈت جواہر لال نہرو اور قائدِ اعظم محمد علی جناح دونوں کے نعرے بازاروں اور سڑکوں میں گونجتے تھے۔ سمجھ میں نہیں آتا تھا۔ کہ ہندوستان اپنا وطن ہے یا پاکستان۔ اور وہ لہو کس کا ہے۔ جو ہر روز اتنی بیدردی سے بہایا جا رہا ہے۔ وہ ہڈیاں کہاں جلائی یا دفن کی جائیں گی۔ جن پر سے مذہب کا گوشت پوست چیلیں اور گدھ نوچ نوچ کر کھا گئے تھے۔ اب کہ ہم آزاد ہوئے ہیں۔ ہمارا غلام کون ہوگا —— جب غلام تھے تو آزادی کا تصور کر سکتے تھے۔ اب آزاد ہوئے ہیں تو غلامی کا تصور کیا ہوگا۔ لیکن سوال یہ ہے کہ ہم آزاد بھی ہوئے ہیں یا نہیں۔

ہندو اور مسلمان دھڑا دھڑ مر رہے تھے۔ کیسے مر رہے تھے۔ کیوں مر رہے تھے —— ان سوالوں کے مختلف جواب تھے۔ ہندوستانی جواب، پاکستانی جواب، انگریزی جواب، ہر سوال کا جواب موجود تھا۔ مگر اس جواب میں حقیقت تلاش کرنے کا سوال پیدا ہوتا۔ تو اس کا کوئی جواب نہ ملتا۔ کوئی کہتا اسے غدر کے کھنڈرات میں تلاش کرو۔ کوئی کہتا نہیں یہ ایسٹ انڈیا کمپنی کی حکومت میں ملے گا۔ کوئی اور پیچھے

ہٹ کر اسے مغلیہ خاندان کی تاریخ میں ٹٹولنے کے لئے کہتا۔ سب پیچھے ہی پیچھے ہٹتے جاتے تھے، اور قاتل اور سفاک برابر آگے بڑھتے جا رہے تھے، اور لہو اور لوہے کی ایسی تاریخ لکھ رہے تھے جس کا جواب تاریخ عالم میں کہیں بھی نہیں ملتا۔

ہندوستان آزاد ہو گیا تھا۔ پاکستان عالم وجود میں آتے ہی آزاد ہو گیا تھا، لیکن انسان ان دونوں مملکتوں میں غلام تھا۔ تعصّب کا غلام — مذہبی جنون کا غلام۔ حیوانیت و بربریت کا غلام —

میں نے ہمیشہ ٹاکیز جانا چھوڑ دیا۔ اشوک اور واچا آتے تو میں خرابیِ طبیعت کا بہانہ کر دیتا۔ اسی طرح کئی دن گذر گئے۔ شیام مجھے دیکھتا اور مسکرا دیتا۔ اس کو میری قلبی کیفیات کا بخوبی علم تھا۔ کچھ دن بہت زیادہ پی کہ میں نے یہ شغل بھی چھوڑ دیا تھا۔ سارا دن گم سم صوفے پر لیٹا رہتا۔ ایک دن شیام اسٹڈیو سے آیا۔ تو اس نے مجھے لیٹا دیکھ کر مزاحیہ انداز میں کہا "کیوں خواجہ جگالی کر رہے ہو؟"

مجھے بہت جھنجھلاہٹ ہوتی تھی۔ کہ شیام میری طرح کیوں نہیں سوچتا۔ اس کے دل و دماغ میں وہ طوفان کیوں برپا نہیں ہیں۔ جن کے ساتھ میں دن رات لڑتا رہتا ہوں۔ وہ اسی طرح مسکراتا، ہنستا اور شور مچاتا رہتا۔ مگر شاید وہ اس نتیجے پر پہنچ چکا تھا۔ کہ جو فضا اس وقت گرد و پیش تھی۔ اس میں سوچنا بالکل بیکار تھا۔

میں نے بہت غور و فکر کیا۔ مگر کچھ سمجھ میں نہ آیا۔ آخر تنگ آ کر میں نے کہا۔ ہٹاؤ۔ چلیں یہاں سے — شیام کی نائٹ شوٹنگ تھی۔ میں نے اپنا اسباب وغیرہ باندھنا شروع کر دیا۔ ساری رات اسی میں گذر گئی۔ صبح ہوئی تو شیام شوٹنگ سے فارغ ہو کر آیا۔ اس نے میرا بندھا ہوا اسباب دیکھا۔ تو مجھ سے صرف اتنا پوچھا: "چلے؟"

میں نے بھی صرف اتنا ہی کہا۔ "ہاں!"

اس کے بعد میرے اور اس کے درمیان "ہجرت" کے متعلق کوئی بات نہ ہوئی۔

بقایا سامان رکھوانے میں اُس نے میرا ہاتھ بٹایا۔ اس دوران میں رات کی شوٹنگ کے لطیفے بیان کرتا رہا۔ اور خوب ہنستا رہا۔ جب میرے رخصت ہونے کا وقت آیا۔ تو اُس نے الماری میں سے برانڈی کی بوتل نکالی۔ دو پیگ بنائے۔ اور ایک مجھے دے کر کہا: "ہپ ٹلا۔"

میں نے جواب میں ہپ ٹلا کہا۔ اور اس نے قہقہے لگاتے ہوئے مجھے اپنے چوڑے سینے کے ساتھ بھینچ لیا: "سٹور کہیں کے۔"

میں نے اپنے آنسو روکے "پاکستان کے"

شیام نے پُرخلوص نعرہ بلند کیا: "زندہ باد پاکستان"

"زندہ باد ہندوستان" اور میں نیچے چلا گیا۔ جہاں ٹرک والا میرا انتظار کر رہا تھا۔ بندرگاہ تک شیام میرے ساتھ گیا۔ جہاز چلنے میں کافی دیر تھی۔ وہ اِدھر اُدھر کے لطیفے سُنا کر میرا دل بہلاتا رہا۔ جب دسل ہوا۔ تو اس نے ہپ ٹلا کہہ کر میرا ہاتھ دبایا۔ اور گینگ وے سے نیچے اُتر گیا۔ مڑ کر اس نے میری طرف نہ دیکھا اور مضبوط قدم اُٹھاتا بندرگاہ سے باہر چلا گیا۔

میں نے لاہور پہنچ کر اس کو خط لکھا۔ انیس ایک اڑتالیس کو اس کا جواب آیا۔

یہاں تمہیں سب لوگ یاد کرتے ہیں۔ تمہاری اور تمہاری بذلہ سنجی کی غیر موجودگی محسوس کرتے ہیں۔ جو تم بڑی فراخدلی سے اُن پر ضائع کرتے تھے۔ واچا ابھی تک اس بات پر مُصر ہے کہ تم کتنی کتر اگئے اب کی دفعہ اس کو اطلاع دیئے بغیر پاکستان بھاگ گئے عجیب منافق بات ہے۔ کہ وہ جو بمبے ٹاکیز میں مسلمانوں کے داخلے کی مخالفت میں سب سے آگے تھا۔ سب سے پہلا آدمی تھا جو پاکستان بھاگ کر چلا گیا — خود کو اپنے نظریے کا شہید بنائے ہوئے —

یہ داتا چاچا کا اپنا نظریہ ہے۔ مجھے اُمید ہے، کہ تم نے اُس کو ضرور خط لکھا ہوگا۔ اگر نہیں لکھا۔ تو فوراً لکھو۔ کم از کم شرافت کا یہی تقاضا ہے۔

تمھارا شیام

آج چودہ اگست ہے۔ وہ دن جب پاکستان اور ہندوستان آزاد ہوئے تھے۔ ادھر اور اُدھر دونوں طرف خوشیاں منائی جا رہی ہیں، اور ساتھ ہی حملے اور دفاع کی تیاریاں بھی زور شور سے جاری ہیں ―― میں شیام کی روح سے مخاطب ہوتا ہوں: "پیارے شیام میں بمبئے ٹاکیز چھوڑ کر چلا گیا تھا۔ پنڈت جواہر لال نہرو کشمیر نہیں چھوڑ سکتے ―― ہے نا ہر پٹلا بات ؟"

# ہائے تم کتنی پتلی ہو

میرا فلم دیکھنے کا شوق امرتسر ہی میں ختم ہو چکا تھا۔ اس قدر فلم دیکھے تھے، کہ اب ان میں میرے لئے کوئی کشش ہی نہ رہی تھی۔ چنانچہ یہی وجہ ہے کہ جب میں ہفتہ وار "مصور" کو ایڈٹ کرنے کے سلسلے میں بمبئی پہنچا۔ تو مہینوں کسی سینما کا رُخ نہ کیا۔ پرچہ فلمی تھا۔ ہر فلم کا پاس مل سکتا تھا۔ مگر طبیعت ادھر راغب ہی نہ تھی۔

بمبئی ٹاکیز کا ایک فلم "اچھوت کنیا" ان دنوں ایک سینما میں ہفتوں سے چل رہا تھا۔ جب اس کی نمائش کا بائیسواں ہفتہ شروع ہوا تو میں نے سوچا اس فلم میں کیا ہے جو اتنی دیر سے چل رہا ہے۔ دیکھنا چاہیئے۔

بمبئی میں یہ میرا پہلا فلم تھا۔ میں نے اس میں پہلی مرتبہ اشوک کمار اور دیوکا رانی کو دیکھا۔ اشوک کمار کا ایکٹنگ خام تھا۔ مگر دیوکا رانی کا کام بہت منجھا ہوا تھا۔ فلم مجموعی طور پر کامیاب تھا۔ ایک خاص بات جو میں نے نوٹ کی یہ تھی، کہ اس میں سوقیانہ پن نہیں تھا۔ ایک سیدھی سادی کہانی تھی۔ جو بڑے صاف ستھرے انداز میں پیش کی گئی تھی۔ میں نے اب گاہے گاہے فلم دیکھنے شروع کر دئیے۔

ان دنوں ایکٹرسوں میں ایک ایکٹرس نسیم بانو خاص مشہور تھی۔ اس کی خوبصورتی کا بہت چرچا تھا۔ اشتہاروں میں اسے پری چہرہ نسیم کہا جاتا تھا۔ میں نے اپنے ہی اخبار میں اس کے کئی فوٹو دیکھے تھے۔ خوش شکل تھی، جوان تھی۔ خاص طور پر

آنکھیں بڑی پُرکشش تھیں۔ اور جب آنکھیں پُرکشش ہوں تو سارا چہرہ پُرکشش بن جاتا ہے۔

نسیم کے غالباً دو فلم تیار ہو چکے تھے۔ جو سہراب مودی نے بنائے تھے۔ اور عوام میں کافی مقبول ہوئے تھے۔ یہ فلم میں نہیں دیکھ سکا۔ معلوم نہیں کیوں؟ عرصہ گذر گیا۔ اب منروا مووی ٹون کی طرف سے اس کے شاندار تاریخی فلم "پکار" کا اشتہار بڑے زوروں پر ہو رہا تھا۔ پری چہرہ نسیم اس میں نور جہاں کے روپ میں پیش کی جا رہی تھی۔ اور سہراب مودی خود اس میں ایک بڑا اہم کردار ادا کر رہے تھے۔

فلم کی تیاری میں کافی وقت صرف ہوا۔ اس دوران میں اخباروں اور رسالوں میں جو "اسٹل" شائع ہوئے بڑے شاندار تھے۔ نسیم، نور جہاں کے لباس فاخرہ میں بڑی پُر وقار دکھائی دے رہی تھی۔

"پکار"، کی نمائش عظمٰے پر میں مدعو تھا۔ جہانگیر کے عدل و انصاف کا ایک من گھڑت قصہ تھا، جو بڑے جذباتی اور تھیٹری انداز میں پیش کیا گیا تھا۔ فلم میں دو باتوں پر بہت زور تھا۔ مکالموں پر اور ملبوسات پر۔ مکالمے گو غیر فطری اور تھیٹری تھے۔ لیکن بہت زوردار اور پُر شکوہ تھے۔ جو سننے والوں پر اثر انداز ہوتے تھے۔ چونکہ ایسا فلم اس سے پہلے نہیں بنا تھا، اس لئے سہراب مودی کا "پکار" سونے کی کان ثابت ہونے کے علاوہ ہندوستانی صنعتِ فلم سازی میں ایک انقلاب پیدا کرنے کا موجب ہوا۔

نسیم کی اداکاری کمزور تھی۔ لیکن اس کمزوری کو اس کے خداداد حسن اور نور جہاں کے لباس نے جو اس پر خوب سجتا تھا، اپنے اندر چھپا لیا تھا۔ مجھے یاد نہیں رہا۔ خیال ہے کہ "پکار" کے بعد نسیم غالباً دو تین فلموں میں پیش ہوئی، مگر

یہ فلم کامیابی کے لحاظ سے "پکار" کا مقابلہ نہ کر سکے۔

اس دوران میں نسیم کے متعلق طرح طرح کی افواہیں پھیل رہی تھیں۔ فلمی دنیا میں اسکینڈل عام ہوتے ہیں۔ کبھی یہ سننے میں آتا تھا کہ سہراب مودی نسیم بانو سے شادی کرنے والا ہے۔ کبھی اخباروں میں یہ خبر شائع ہوتی تھی کہ نظام حیدرآباد کے صاحبزادے معظم جاہ صاحب نسیم بانو پر ڈورے ڈال رہے ہیں اور عنقریب اُسے لے اُڑیں گے۔ یہ خبر درست تھی، کیونکہ شہزادے کا قیام ان دنوں اکثر بمبئی میں ہوتا تھا۔ اور وہ کئی بار نسیم کے مکان واقع میرین ڈرائیو پر دیکھے گئے تھے۔

شہزادے نے لاکھوں روپے خرچ کئے۔ بعد میں حسن کا حساب دینے کے سلسلے میں انہیں بڑی الجھنوں کا سامنا کرنا پڑا لیکن یہ بعد کی بات تھی۔ آپ روپے کے زور سے نسیم کی والدہ شمشاد عرف چھمیاں کو رضامند کرنے میں کامیاب ہو گئے۔ چنانچہ پری چہرہ نسیم کا التفات خرید کر آپ اُسے اس کی والدہ سمیت حیدرآباد لے گئے۔

تھوڑے ہی عرصے کے بعد جہاندیدہ چھمیاں نے یہ محسوس کیا کہ حیدرآباد ایک قید خانہ ہے جس میں اس کی بچی کا دم گھٹ رہا ہے۔ آرام و آسائش کے تمام سامان موجود تھے۔ مگر فضا میں گھٹن سی تھی۔ پھر کیا پتہ تھا کہ شہزادے کی لاابالی طبیعت میں ایکا ایکی انقلاب آجاتا۔ اور نسیم بانو اِدھر کی رہتی نہ اُدھر کی۔ چنانچہ چھمیاں نے حکمتِ عملی سے کام لیا۔ حیدرآباد سے نکلنا بہت مشکل تھا۔ مگر وہ اپنی بچی نسیم کے ساتھ واپس بمبئی آنے میں کامیاب ہو گئی۔

اس کی آمد پر کافی شور مچا۔ بڑی پوسٹر بازی ہوئی۔ دو پارٹیاں بن گئی تھیں۔ ایک شہزادہ معظم جاہ کے کاسہ لیسوں کی، دوسری نسیم بانو کے ہمدردوں کی۔ بہت دیر تک کیچڑ اچھالی گئی۔ اس کے بعد یہ معاملہ خاموش ہو گیا۔

میں اب فلمی دنیا میں داخل ہو چکا تھا۔ کچھ دیر "منشی" کی حیثیت سے امپیریل فلم کمپنی میں کام کیا یعنی ڈائرکٹروں کے حکم کے مطابق اُلٹی سیدھی زبان میں فلموں کے مکالمے لکھتا رہا۔ ساٹھ روپے ماہوار پہ۔ ترقی کی تو ہندوستان سے ٹوٹن میں سیٹھ نانو بھائی ڈیسائی کے یہاں سو روپے ماہوار پہ ملازم ہو گیا۔ یہاں میں نے اپنی پہلی فلمی کہانی "مڈ" کے عنوان سے لکھی۔ اس کا عرف "اپنی نگریا" تھا۔ کہنا یہ ہے کہ اب فلمی حلقے میرے نام سے واقف ہو چکے تھے۔

اس دوران میں ایک اعلان نظروں سے گذرا کہ کوئی صاحب احسان ہیں انہوں نے ایک فلم کمپنی تاج محل پکچرز کے نام سے قائم کی ہے۔ پہلا فلم "اجالا" ہوگا جس کی ہیروئن پری چہرہ نسیم بانو ہے۔

اس فلم کے بنانے والوں میں دو مشہور ہستیاں تھیں، "پکار" کا مصنف کمال امروہوی اور "پکار" ہی کا پبلسٹی منیجر ایم، اے معنی فلم کی تیاری کے دوران میں کئی جھگڑے کھڑے ہوئے۔ امیر حیدر کمال امروہی اور ایم، اے معنی کی کئی بار آپس میں جنگ ہوئی۔ یہ دونوں حضرات غالباً عدالت تک بھی پہنچے۔ مگر "اجالا" انجام کار مکمل ہو ہی گیا۔

کہانی معمولی تھی۔ موسیقی کمزور تھی۔ ڈائرکشن میں کوئی دم نہیں تھا۔ چنانچہ یہ فلم کامیاب نہ ہوا۔ اور احسان صاحب کو کافی خسارہ اُٹھانا پڑا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ان کو اپنا کاروبار بند کرنا پڑا۔

مگر اس کاروبار میں وہ اپنا دل نسیم بانو کو دے بیٹھے۔ احسان صاحب کے لئے نسیم اجنبی نہیں تھی۔ ان کے والد خان بہادر محمد سلیمان چیف انجینیر نسیم کی والدہ عرف چھمیاں کے پرستار تھے۔ بلکہ یوں کہئے کہ ایک لحاظ سے وہ ان کی دوسری بیوی تھی۔ احسان صاحب کو یقیناً نسیم سے ملنے کا اتفاق ہوا ہوگا۔ فلم کی تیاری کے دوران

میں تو خیر وہ نسیم کے بالکل قریب رہے تھے۔ لیکن لوگوں کا بیان ہے کہ احسان اپنی جھینپو اور شرمیلی طبیعت کے باعث نسیم سے پوری طرح کھل نہیں سکے تھے۔ سیٹ پر آتے تو خاموش ایک کونے میں بیٹھے رہتے۔ نسیم سے بہت کم بات کرتے۔ کچھ بھی ہو، آپ اپنے مقصد میں کامیاب ہو گئے۔ کیونکہ ایک دن ہم نے سُنا کہ پری چہرہ نسیم نے مسٹر احسان سے دلّی میں شادی کر لی ہے۔ اور یہ ارادہ ظاہر کیا ہے کہ اب وہ فلموں میں کام نہیں کرے گی۔

نسیم بانو کے پرستاروں کے لئے یہ خبر بڑی افسوس ناک تھی۔ اس کے حُسن کا جلوہ چونکہ صرف ایک آدمی کے لئے وقف ہو گیا تھا۔

احسان اور نسیم کا عشق تمام مراحل طے کر کے شادی کی منزل تک کیسے پہنچا مجھے اس کا علم نہیں۔ لیکن اس سلسلے میں اشوک کمار کا بیان بہت دلچسپ ہے۔ اشوک ایک صاحب کیپٹن صدیقی کا دوست تھا۔ یہ مسٹر احسان کے قریبی عزیز تھے "اجالا" میں انہوں نے کافی روپیہ لگایا تھا۔

اشوک قریب قریب ہر روز کیپٹن صدیقی کے یہاں جایا کرتا تھا۔ کچھ دنوں سے وہ محسوس کر رہا تھا کہ کیپٹن صاحب کے گھر کی فضا بدلی ہوئی ہے۔ شروع شروع میں تو وہ کچھ سمجھ نہ سکا۔ لیکن ایک دن اس کی ناک نے محسوس کیا کہ ہوا میں بہت ہی عمدہ سینٹ کی خوشبو بسی ہوئی ہے۔ اشوک نے ازراہِ مذاق کیپٹن صدیقی سے اس خوشبو کے ماخذ کے بارے میں پوچھا۔ لیکن وہ گول کر گئے۔

ایک دن جب اشوک، صدیقی صاحب کے گھر گیا۔ تو وہ موجود نہیں تھے۔ لیکن وہ خوشبو موجود تھی۔ بڑی لطیف لیکن بڑی شریر۔ اشوک نے سونگھ سونگھ کر ناک کے ذریعے سے معلوم کر لیا کہ یہ اوپر کی منزل سے آ رہی ہے۔ سیڑھیاں طے کر کے وہ اوپر پہنچا۔ کمرے کے کواڑ تھوڑے سے کھلے تھے۔ اشوک نے جھانک کر دیکھا۔

نسیم بانو پلنگ پر لیٹی تھی اور اس کے پہلو میں ایک صاحب بیٹھے اس سے ہولے ہولے باتیں کر رہے تھے۔ اشوک نے پہچان لیا۔ مسٹر احسان تھے۔ جن سے اس کا تعارف ہو چکا تھا۔

اشوک نے جب کیپٹن صدیقی سے اس معاملے کے متعلق بات کی تو وہ مسکرائے "یہ سلسلہ کافی دیر سے جاری ہے"

اشوک کے اس بیان سے نسیم اور احسان کے اس معاشقے پر جو روشنی پڑتی ہے۔ اس پہ کسی تبصرے کی ضرورت نہیں۔ عشق و محبت میں جو کچھ ہوتا ہے ہوا ہوگا۔ مجھے اتنا علم ہے کہ احسان کی والدہ اور بہنیں سخت خلاف تھیں۔ کہ وہ نسیم سے شادی کرے۔ چنانچہ اس سلسلے میں بہت جھگڑے ہوئے۔ مگر خان بہادر محمد سلیمان صاحب کو کوئی اعتراض نہیں تھا۔ اس لیئے یہ شادی عمل میں آگئی۔ اور نسیم فلمی دنیا سے دور دلی میں رہنے لگی۔ جہاں اس نے اپنے بچپن کے دن گذارے تھے۔

شادی پر اور شادی کے بعد کچھ دیر اخباروں میں ہنگامہ رہا۔ مگر پھر نسیم فلمی حلقوں سے اوجھل ہو گئی۔

اس دوران میں فلمی دنیا میں کئی انقلاب آئے۔ کئی فلم کمپنیاں بنیں۔ کئی ٹوٹیں کئی ستارے اُبھرے کئی ڈوبے۔ ہمانسو رائے کی افسوسناک موت کے بعد بمبئی ٹاکیز میں طوائف الملوکی پھیلی ہوئی تھی۔ دیوکا رانی (مسز ہمانسو رائے) اور رائے بہادر چونی لال (جنرل منیجر) میں بات بات پر چلتی تھی نتیجہ یہ ہوا کہ رائے بہادر اپنے گروپ کے ساتھ بمبئی ٹاکیز سے علیحدہ ہو گئے۔ اس گروپ میں پروڈیوسر ایس مکرجی افسانہ نگار اور ڈائرکٹر گیان مکرجی۔ مشہور ہیرو اشوک کمار۔ کوی پردیپ، ساؤنڈ ریکارڈسٹ ایس واچا۔ کامیڈین وی ایچ ڈیسائی، مکالمہ نگار شاہد لطیف اور سنتوشی شامل تھے۔

بمبئی ٹاکیز سے نکلتے ہی اس گروپ نے ایک نئی فلم کمپنی "فلمستان" کے نام سے قائم کی۔ پروڈکشن کنٹرولر ایس مکرجی مقرر ہوئے۔ جو سلور جوبلی فلم بنا کر بہت شہرت حاصل کر چکے تھے۔ کہانی وہانی لکھی گئی۔ اسٹوڈیو نئے ساز و سامان سے آراستہ ہو گیا۔ سب ٹھیک ٹھاک تھا۔ مگر پروڈیوسر ایس مکرجی سخت پریشان تھے۔ بمبئی ٹاکیز سے علیحدہ ہو کر وہ دیوکا رانی کو خار دینے کے لئے کوئی سنسنی پھیلانے والی بات پیدا کرنا چاہتے تھے۔ اور یہ بات ہیروئن کے انتخاب کے متعلق تھی۔

بیٹھے بیٹھے ایک دن ایس مکرجی کو یہ سوجھی کہ نسیم بانو کو واپس کھینچ کر لایا جائے یہ وہ زمانہ تھا، جب اُسے اپنے اوپر پورا اعتماد تھا پے در پے کئی کامرانیوں کے بعد اس کو یہ محسوس ہونے لگا تھا، کہ وہ جس کام میں ہاتھ ڈالے گا پورا کر لے گا۔ چنانچہ فوراً ہی نسیم بانو تک پہنچنے کے راستے سوچ لئے گئے۔

اشوک کی وجہ سے ایس مکرجی کے بھی کیپٹن صدیقی سے بڑے اچھے تعلقات تھے۔ اس کے علاوہ رائے بہادر چونی لال کے احسان کے والد خان بہادر محمد سلیمان سے بہت بے تکلف مراسم تھے۔ چنانچہ دلی میں نسیم تک رسائی حاصل کرنے میں ایس مکرجی کو کسی مشکل کا سامنا نہ کرنا پڑا۔ لیکن سب سے بڑا مرحلہ پہلے احسان کو اور پھر نسیم کو رضامند کرنا تھا۔

مکرجی کی خود اعتمادی کام آئی۔ احسان نے پہلے تو صاف جواب دے دیا۔ لیکن آخر کار رضامند ہو گیا۔ فتح مند ہو کر جب وہ بمبئی واپس آیا تو اخباروں میں یہ خبر بڑے ٹھاٹ سے شائع کرائی کہ فلمستان کے پہلے فلم "چل چل رے نوجوان" کی ہیروئن پری چہرہ نسیم بانو ہو گی۔ فلمی حلقوں میں سنسنی پھیل گئی۔ کیونکہ نسیم فلمی دنیا سے ہمیشہ کے لئے علیحدگی اختیار کر چکی تھی۔

پچاس زمانے کی بات ہے جب میں ڈیڑھ برس آل انڈیا ریڈیو دلی کے ساتھ

منسلک رہ کر واپس بمبئی آیا تھا۔ اور سید شوکت حسین رضوی کے لئے ایک کہانی لکھنے میں مصروف تھا۔

یہ کہانی لکھی گئی۔ چند اور کہانیاں بھی لکھی گئیں۔ اس دوران میں گھر سے نکلنا بہت کم ہوتا تھا۔ میری بیوی میرے اس "گھریلو پنے" سے تنگ آگئی تھی۔ اس کا خیال تھا کہ میں یوں اپنی صحت خراب کر رہا ہوں۔

شاہد لطیف سے میرے مراسم علی گڈھ یونیورسٹی سے چلے آرہے تھے فلمستان کے کاموں سے جب بھی فراغت ملتی۔ میرے یہاں ضرور آتا۔ ایک دن آیا تو میری بیوی نے اس سے کہا۔ "شاہد بھائی ان سے کہئے کہیں ملازمت کریں۔ گھر بیٹھ کر ان کا کام کرنا مجھے اچھا نہیں لگتا۔ صحت خراب کر رہے ہیں۔ کہیں ملازمت کرینگے تو گھر سے باہر تو قدم رکھیں گے۔"

چند روز کے بعد "ملاد" سے شاہد لطیف کا فون آیا، کہ پروڈیوسر ایس مکرجی مجھ سے انٹرویو کرنا چاہتے ہیں کیونکہ سینریو ڈیپارٹمنٹ کے لئے انہیں ایک آدمی کی ضرورت ہے۔"

ملازمت کی مجھے کوئی خواہش نہیں تھی۔ صرف اسٹڈیو دیکھنے کے لئے میں فلمستان چلا گیا۔ فضا بڑی اچھی تھی جیسے کسی یونیورسٹی کی۔ اس نے مجھے بہت متاثر کیا۔ مکرجی سے ملاقات ہوئی۔ تو وہ مجھے بے حد پسند آئے۔ چنانچہ وہیں کنٹریکٹ پر دستخط کر دئے۔ تنخواہ بہت تھوڑی تھی۔ کُل تین سو روپے ماہوار۔ اور فاصلہ بھی کافی تھا۔ الیکٹرک ٹرین سے ایک گھنٹہ کے قریب لگتا تھا "گورے گاؤں" پہنچنے میں۔ لیکن میں نے سوچا ٹھیک ہے تنخواہ تھوڑی ہے لیکن میں اِدھر اُدھر سے کما لیا کروں گا۔

شروع شروع میں تو فلمستان میں میری حالت اجنبی کی سی تھی۔ لیکن بہت جلد میں تمام اسٹاف کے ساتھ گھل مل گیا۔ ایس مکرجی سے تو میرے تعلقات

دوستانہ حد تک پہنچ گئے تھے۔

اس دوران میں نسیم بانو کی صرف چند جھلکیاں دیکھنے کا اتفاق ہوا۔ چونکہ سینریو لکھا جا رہا تھا، اس لئے وہ چند لمحات کے لئے موڈ میں آتی، اور واپس چلی جاتی تھی۔

ایس مکرجی بڑا مشکل پسند واقع ہوا ہے۔ مہینوں کہانی کی نوک پلک درست کرنے میں لگ گئے۔ خدا خدا کر کے فلم کی شوٹنگ شروع ہوئی۔ مگر یہ وہ سین تھے، جن میں نسیم بانو نہیں تھی۔ بالآخر اس سے ایک روز ملاقات ہوئی۔ اسٹڈیو کے باہر فولڈنگ کرسی پر بیٹھی تھی۔ ٹانگ پر ٹانگ رکھے تھرموس سے چائے پی رہی تھی۔ اشوک نے میرا اس سے تعارف کرایا۔ خندہ پیشانی سے پیش آئی۔ اور بڑی باریک آواز میں کہا "میں نے ان کے مضامین اور افسانے پڑھے ہیں"۔

تھوڑی دیر رسمی گفتگو ہوئی۔ اور یہ پہلی ملاقات ختم ہوئی۔ چونکہ وہ میک اَپ میں تھی۔ اس لئے میں اس کے اصلی حسن کا اندازہ نہ کر سکا۔ ایک بات جو میں نے خاص طور پر نوٹ کی۔ وہ یہ تھی کہ بولتے وقت اسے کوشش سی کرنی پڑتی تھی۔ یوں کہئے کہ جب وہ بولتی تھی، تو مجھے یوں محسوس ہوتا تھا کہ وہ تھوڑی سی مشقت کر رہی ہے۔

"پکار" کی نسیم میں اور "چل چل رے نوجوان" کی نسیم میں زمین و آسمان کا فرق تھا۔ اُدھر وہ ملکہ نورجہاں کے لباس فاخرہ میں ملبوس اور اِدھر بھارت سیوادل کی ایک رضاکار کی وردی میں۔ نسیم بانو کو تین چار مرتبہ میک اَپ کے بغیر دیکھا تو میں نے سوچا آرائش محفل کے لئے اس سے بہتر عورت اور کوئی نہیں ہو سکتی۔ وہ جگہ، وہ کونہ جہاں وہ بیٹھتی یا کھڑی ہوتی ایک دم سج جاتا۔

لباس کے انتخاب میں وہ بہت محتاط ہے۔ اور رنگ چننے کے معاملے میں، جو سلیقہ اور قرینہ میں نے اس کے یہاں دیکھا ہے اور کہیں نہیں دیکھا۔ زرد رنگ

بڑا خطرناک ہے۔ کیونکہ زرد رنگ کے کپڑے آدمی کو اکثر زرد مریض بنا دیتے ہیں۔ مگر نسیم کچھ اس بے پروا بے تکلفی سے یہ رنگ استعمال کرتی تھی، کہ مجھے حیرت ہوتی تھی۔

نسیم کا محبوب لباس ساڑھی ہے۔ غرارہ بھی پہنتی ہے مگر گاہے گاہے شلوار قمیض پہنتی ہے مگر صرف گھر میں، وہ کپڑے پہنتی ہے استعمال نہیں کرتی۔ یہی وجہ ہے کہ اس کے پاس برسوں کے پرانے کپڑے بڑی اچھی حالت میں موجود ہیں۔

نسیم کو میں نے بہت محنتی پایا۔ بڑی نازک سی عورت ہے۔ مگر سیٹ پر برابر ڈٹی رہتی تھی۔ مکرجی کو مطمئن کرنا آسان کام نہیں۔ کئی کئی ریہرسلیں کرنا پڑتی تھیں۔ گھنٹوں جلسا دینے والی روشنی کے سامنے اُٹھک بیٹھک کرنا پڑتی تھی لیکن میں نے دیکھا کہ نسیم اُکتاتی نہیں تھی۔ مجھے بعد میں معلوم ہوا کہ اس کو اداکاری کا بہت شوق ہے۔ ہم شوٹنگ کے ساتھ ساتھ رشز دیکھتے تھے۔ نسیم بانو کا کام بس گزارا تھا اس میں چمک نہیں تھی۔ وہ سنجیدہ ادائیں مہیا کر سکتی ہے۔ اپنے مغلئی خدوخال کی حسین جھلکیاں پیش کر سکتی ہے لیکن ناقدانہ نگاہوں کے لئے اداکاری کا جوہر پیش نہیں کر سکتی۔ لیکن پھر بھی "چل چل رے نوجوان" میں اس کا ایکٹنگ پہلے فلموں کے مقابلے میں کچھ بہتر ہی تھا۔

مکرجی اس میں کرختگی اور درشتگی پیدا کرنا چاہتا تھا۔ مگر یہ کیسے پیدا ہوتی۔ نسیم بے حد سرد مزاج ہے۔ چنانچہ نتیجہ یہ ہوا کہ "چل چل رے نوجوان" میں نسیم کا کیریکٹر گڈمڈ ہو کے رہ گیا۔

فلم ریلیز ہوا۔ رات کو تاج میں ایک شاندار پارٹی دی گئی۔ فلم میں نسیم جیسی بھی تھی ٹھیک ہے۔ مگر تاج میں وہ سب سے الگ نظر آتی تھی۔ پروقار باعظمت مغلیہ شہزادیوں کی سی شان اور انفرادیت لئے۔

"چل چل رے نوجوان" کی تیاری میں دو برس، دو اُکتا دینے والے برس لگ گئے تھے۔ جب فلم توقعات کے مطابق کامیاب اور مقبول نہ ہوا تو ہم سب پر افسردگی طاری ہو گئی۔ مکرجی تو بہت بے دل ہوا، مگر کنٹریکٹ کے مطابق چونکہ اُسے تاج محل پکچرز کے ایک فلم کی نگرانی کرنا تھی۔ اس لئے مکرجی بستہ ہو کہ کام شروع کرنا پڑا۔

فلم "چل چل رے نوجوان" کی تیاری کے دوران میں احسان سے مکرجی کے تعلقات بہت بڑھ گئے تھے۔ جب تاج محل پکچرز کے فلم کا سوال آیا، تو احسان نے اس کی پروڈکشن کا سارا بوجھ مکرجی کے کندھوں پر ڈال دیا۔ مکرجی نے مجھ سے مشورہ کیا۔ آخر یہ طے ہوا کہ "بیگم" کے عنوان سے میں ایک ایسی کہانی لکھوں جس میں نسیم کی خوبصورتی کو زیادہ سے زیادہ استعمال کیا جا سکے۔

میں نے ایک خاکہ تیار کیا۔ مکرجی نے اس میں کچھ تبدیلیاں کرائیں۔ جب فلم تیار ہوا تو میں نے بڑی حیرت سے یہ محسوس کیا کہ جو کہانی میں نے سوچی تھی، وہ تو ردی کاغذوں پر ہے۔ اور جو پردے پر چل پھر رہی ہے۔ وہ محض اس کا ہلکا سا سایہ ہے۔

کہانی کا قصہ چھوڑیئے۔ مجھے کہنا یہ ہے کہ "بیگم" لکھنے کے دوران میں مجھے نسیم بانو کو بہت قریب سے دیکھنے کے مواقع ملے۔ میں اور مکرجی دوپہر کا کھانا اُن کے گھر پہ کھاتے تھے۔ اور ہر روز رات کو دیر تک کہانی میں ترمیم و تنسیخ کرنے میں مصروف رہتے تھے۔

میرا خیال تھا نسیم بڑے عالی شان مکان میں رہتی ہے۔ لیکن جب گھوڑ بندر روڈ پر اس کے بنگلے میں داخل ہوا۔ تو میری حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی۔ بنگلہ نہایت شکستہ حالت میں تھا۔ بڑا معمولی قسم کا فرنیچر، جو غالباً کرائے پر لایا گیا تھا۔ گھسا ہوا

قالین، دیواریں اور فرش سیل زدہ۔

اس پس منظر کے ساتھ میں نے پری چہرہ نسیم بانو کو دیکھا۔ بنگلے کے برآمدے میں وہ گوالے سے دودھ کے کوٹوں کے متعلق بات چیت کر رہی تھی۔ اس کی دبی دبی آواز، جو ایسا معلوم ہوتا تھا کوشش کے ساتھ حلق سے نکالی جا رہی ہے۔ گوالے سے قبولوا رہی تھی کہ اس نے آدھ سیر دودھ کا ہیر پھیر کیا ہے۔ آدھ سیر دودھ اور پری چہرہ نسیم بانو۔ جس کے لئے کئی فرہاد دودھ کی نہریں نکالنے کے لئے تیار تھے — میں چکرا گیا۔

آہستہ آہستہ مجھے معلوم ہوا کہ "پکار" کی نور جہاں بڑی گھریلو قسم کی عورت ہے۔ اور اس میں وہ تمام قسم کی خصوصیات موجود ہیں جو ایک غایت درجہ گھریلو عورت میں ہوتی ہے۔ اس کی پکچر "بیگم" کی پروڈکشن شروع ہوئی۔ تو ملبوسات کا سارا کام اس نے سنبھال لیا۔ اندازہ تھا کہ دس بارہ ہزار روپے اس مد پر اُٹھ جائیں گے۔ مگر نسیم نے درزی گھر میں بٹھا کر اپنی پرانی ساڑھیوں، قمیضوں اور غراروں سے تمام لباس تیار کروا لئے۔

نسیم کے پاس بے شمار کپڑے ہیں۔ میں اس سے قبل کہہ چکا ہوں کہ وہ لباس پہنتی ہے استعمال نہیں کرتی۔ اس پر ہر لباس سجتا ہے۔ یہی وجہ ہے، کہ "بیگم" میں ایس مکرجی نے اس کو کشمیر کے دیہات کی ایک الھڑ لڑکی کے روپ میں پیش کیا۔ اس کو قلو پطرہ بنایا۔ ہیر کا لمبا کرتہ اور لاچا پہنایا۔ موڈرن لباس میں بھی پیش کیا۔

یقین واثق تھا کہ صرف ملبوسات کے تنوع ہی کے باعث "بیگم" بے حد مقبول ثابت ہوگی، مگر افسوس کہ تکنی ڈائرکشن اور کمزور میوزک کی وجہ سے اس نے درمیانے درجے کی فلموں کی بزنس کی۔

ہم سب نے اس فلم کی تیاری پر بہت محنت کی تھی۔ خاص طور پر مکرجی نے، ہم سب دیر تک (بعض اوقات رات کے تین تین بجے تک) بیٹھے کام کرتے رہتے۔ میں اور مکرجی کہانی کی نوک پلک درست کرتے رہتے۔ اور نسیم اور احسان جاگنے کی کوشش کرتے رہتے۔ جب تک احسان صاحب کی ٹانگ ہلتی رہتی، وہ میری اور مکرجی کی باتیں سنتے رہتے۔ لیکن جوں ہی ان کی ٹانگ ہلنا بند ہو جاتی، ہم سب سمجھ جاتے کہ وہ گہری نیند سو چکے ہیں۔

نسیم کو اس سے بڑی جھنجھلاہٹ ہوتی تھی، کہ اس کا شوہر نیند کا ایسا ماتا ہے کہ کہانی کے نہایت ہی دشوار گذار موڑ پہ لمبی تان کر سو جاتا ہے میں اور مکرجی احسان کو چھیڑتے تھے۔ تو نسیم بہت جز بز ہوتی تھی۔ وہ ان کو اپنی طرف سے جھنجھوڑ کر جگاتی تھی۔ مگر ایسا معلوم ہوتا کہ لوری دے کر انہیں اور گہری نیند سلا رہی ہے — جب نسیم کی آنکھیں بھی مُندنے لگتیں تو مکرجی رخصت چاہتے اور چلے جاتے۔

میرا گھر گھوڑ بندر سے بہت دور تھا۔ برقی ٹرین قریب قریب پون گھنٹے میں مجھے وہاں پہنچاتی تھی۔ ہر روز نصف شب کے بعد گھر پہنچتا۔ ایک اچھا خاصہ عذاب تھا۔ میں نے جب اس کا ذکر مکرجی سے کیا تو یہ طے ہوا کہ میں کچھ عرصے کے لئے نسیم ہی کے یہاں اُٹھ آؤں۔

احسان بے حد جھینپو ہیں، کوئی بات کہنا ہو تو برسوں لگا دیتے ہیں! انہیں میری آسائش کا خیال تھا۔ وہ چاہتے تھے کہ جس چیز کی مجھے ضرورت ہو، میں ان سے بلا تکلّف کہہ دیا کروں۔ مگر تکلف کی یہ حد تھی، کہ وہ حرفِ مدعا زبان پر لا ہی نہیں پاتے تھے۔ آخر ایک روز ان کے اصرار پر نسیم نے مجھ سے کہا: "تہانوں جس چیز دی ضرورت ہووے دس دیا کرو۔"

نسیم فسٹ کلاس پنجابی بولتی تھی۔ "چل چل رے نوجوان" کے زمانے میں جب

میں نے رفیق غزنوی سے جو اس پکچر میں ایک اہم رول ادا کر رہا تھا۔ ذکر کیا، کہ نسیم پنجابی بولتی ہے۔ تو اس نے اپنے مخصوص انداز میں مجھ سے کہا، کہ تم بکتے ہو میں نے اس کو یقین دلانے کی کوشش کی، مگر وہ نہ مانا۔

ایک روز شوٹنگ کے دوران میں جب نسیم اور رفیق دونوں موجود تھے، اور اشوک انگریزی کے "زبان مروڑ" فقرے نسیم سے کہلوانے کی کوشش کر رہا تھا۔ تو میں نے رفیق سے پوچھا۔ "لالے! ادھڑ ونجا کسے کہتے ہیں؟"

رفیق نے جواب دیا۔ "یہ کس زبان کا لفظ ہے؟"

میں نے کہا "پنجابی زبان کا ـــــ بتاؤ اس کا کیا مطلب ہے؟"

رفیق نے اپنے مخصوص انداز میں کہا۔ "مینوں معلوم نئیں۔ اوا دھڑ ونجے دے پتّر۔"

نسیم نے گردن میں ہلکا سا خم دے کر رفیق کی طرف دیکھا اور مسکرا کر پنجابی میں اس سے پوچھا۔ "سچی۔ تہانوں ملوم نئیں۔"

رفیق نے جب نسیم کے منہ سے پنجابی سنی، تو بقول شخصے وہ اپنی پشتو بھول گیا۔ لکنت بھرے لہجہ میں اس نے نسیم سے اردو میں کہا ـــــ "آپ پنجابی جانتی ہیں؟"

نسیم نے اسی طرح مسکرا کر کہا "جی ہاں!"

میں نسیم سے مخاطب ہوا۔ "تو آپ بتائیے۔ ادھڑ ونجے کا مطلب کیا ہے؟"

نسیم نے کچھ دیر سوچا۔ "وہ ـــ وہ لباس جو گھر میں استعمال کیا جاتا ہے۔"

رفیق غزنوی اپنی پشتو اور زیادہ بھول گیا۔

نسیم کی نانی امرتسر کی کشمیرن تھی۔ پنجابی زبان اس نے غالباً اسی سے سیکھی تھی۔ اردو اس لئے بہت شستہ و رفتہ بولتی ہے کہ دلّی میں اپنی ماں کے ساتھ

رہی۔ انگریزی جانتی ہے۔ اس لیئے کہ کنونٹ میں پڑھتی تھی۔ موسیقی سے شغف رکھتی ہے۔ اس کی تعلیم ماں ہی سے پائی۔ مگر ماں جیسا سُریلا گلا نہ پایا۔ فلموں میں اپنے گانے خود ہی گاتی ہے۔ مگر اُن میں رس نہیں ہوتا۔ لیکن اب میں نے سُنا ہے کہ اُس نے خود گانا ترک کر دیا ہے۔

نسیم کے اردگرد جو ایک خیرہ کُن ہالہ تھا۔ آہستہ آہستہ غائب ہو گیا۔ مجھے اُن کے نئے کے غسل خانے میں پہلی بار نہانے کا اتفاق ہوا، تو مجھے بڑی ناامیدی ہوئی میرا خیال تھا کہ وہ جدید ساز و سامان سے آراستہ ہو گا۔ متعدد قسم کے نہانے والے نمک ہوں گے۔ نایاب صابن ہو گا۔ ٹب ہو گا۔ اور تمام اوٹ پٹانگ چیزیں ہوں گی۔ جو حسین عورتیں اور ایکٹرسیں اپنے حسن کی افزائش کے لیئے استعمال کرتی ہیں۔ مگر وہاں صرف ایک جست کی بالٹی تھی۔ ایلومینیم کا ایک ڈونگا اور ملاڈ کے کنوئیں کا بھاری پانی کہ صابن گھستے رہو اور جھاگ پیدا نہ ہو۔

لیکن نسیم کو جب بھی دیکھو، تر و تازہ اور نکھری نکھری نظر آتی تھی میک اَپ کرتی تھی مگر ہلکا ——— شوخ رنگوں سے اسے نفرت ہے۔ وہ صرف وہی رنگ استعمال کرتی ہے جو اس کے مزاج کے موافق ہوں یعنی معتدل۔

عطریات سے اس کو عشق ہے۔ چنانچہ انواع و اقسام کی خوشبویات اس کے پاس موجود رہتی ہیں۔ بعض سینٹ تو بہت ہی قیمتی اور نایاب ہیں۔ زیور ایک سے ایک اعلیٰ اور بیش قیمت ہے۔ مگر ان میں لدی پھندی نہیں ہوتی۔ کبھی ہیرے کا ایک کنگن پہن لیا۔ کبھی جڑاؤ چوڑیاں اور کبھی موتیوں کا ہار۔

ان کا دسترخوان میں نے کبھی پُر تکلف نہیں دیکھا۔ احسان کو دمے کی شکایت رہتی ہے۔ اور نسیم کو زکام کی۔ دونوں پرہیز کی کوشش کیا کرتے تھے۔ نسیم میری ہری مرچیں لے اُڑتی تھی۔ اور احسان نسیم کی پلیٹ پر ہاتھ صاف کر دیتے تھے۔

دونوں میں کھانے پر قریب قریب ہر روز ایک عجیب بچگانہ قسم کی بحث ہوتی تھی۔ دونوں کی نگاہیں جب اس دوران میں ایک دوسرے سے ٹکراتیں، تو دیکھنے والوں کو صاف پتہ لگ جاتا کہ وہ محبت آشنا ہیں۔

نسیم کو جب میری بیوی نے اپنے یہاں مدعو کیا تو اُسے سالنوں میں استعمال کیا ہوا گھی بہت پسند آیا۔ کھانے کی میز ہی پر اُس نے پوچھا "یہ گھی آپ کہاں سے منگواتی ہیں؟"

میری بیوی نے جواب دیا۔ "بازار سے ——— پولسن کا گھی ہے — عام ملتا ہے۔"

نسیم نے کہا — "دو ڈبے مجھے منگوا دیجئے۔" میں نے نوکر سے کہا۔ وہ فوراً ہی پاس والے اسٹور سے جس کے ساتھ میرا حساب چلتا تھا۔ دو ڈبے لے آیا۔

اسی طرح وہ کل آٹھ ٹین لے گئی۔ ایک دن مجھ سے کہنے لگی۔ "آپ وہ گھی کا حساب تو کر لیجئے۔"

میں نے کہا۔ "اس کی کیا ضرورت ہے؟"

لیکن جب اس نے اصرار کیا تو میں نے کہا۔ "کُل آٹھ ٹین ہوتے ہیں ——— آپ حساب کر لیجئے۔"

نسیم نے کچھ دیر سوچنے کے بعد کہا۔ "آٹھ؟ میرا خیال ہے سات ٹین آئے ہیں۔"

"سات ہی ہوں گے۔"

"ہوں گے کیا — آپ کہتے ہیں تو آٹھ ہی ہوں گے۔"

"آپ نے بھی ہوں گے ہی کہا۔"

کافی دیر تک سات اور آٹھ کا ہیر پھیر رہا۔ نسیم کے حساب کے مطابق ٹین سات تھے۔ اور میرے اور اسٹور والے کے حساب کے مطابق آٹھ۔ فیصلہ یوں ہی

ہوسکتا تھا کہ ہم میں سے ایک دوسرے کا حساب مان لے۔ مگر جب بات حساب کی تھی، تو کون مانتا۔ آخر نسیم نے اپنے ملازم سے کہا کہ خالی ٹین اکٹھے کرے۔ جب یہ اکٹھے کرکے نسیم کے روبرو پیش کئے گئے تو ان کی تعداد سات تھی۔ نسیم نے فاتحانہ انداز میں میری طرف دیکھا اور کہا: "گن لیجئے سات ہیں۔"

میں نے پھر کہا۔ "سات ہی ہوں گے ـــــ لیکن میرے حساب کے مطابق آٹھ ہوتے ہیں۔"

ملازم نسیم سے مخاطب ہوا۔ "جی ہاں! آٹھ ہی ہوتے ہیں۔ ایک ٹھنگن لے گئی تھی۔"

میں ان سے پانچسو روپے ماہوار لیتا تھا۔ ہر مہینے اس کی پائی پائی کا حساب ہوتا تھا۔ لیکن اس میں کبھی سات اور آٹھ کا ہیر پھیر نہ ہوا۔ میاں بیوی دونوں میرے کام سے مطمئن تھے لیکن مسٹر احسان کسی حد تک میری تیز طبیعت سے نالاں تھے۔ مگر اس کا اظہار وہ اپنی حد سے بڑھی پُرتکلف طبیعت کے باعث مجھ پر کبھی نہ کرسکے۔

بظاہر مسٹر احسان بہت دبیل قسم کے انسان ہیں۔ مگر اپنی بیوی کے معاملے میں بہت سخت گیر قسم کے واقع ہوئے ہیں۔ نسیم کو صرف خاص خاص لوگوں سے ملنے کی اجازت ہے۔ عام ایکٹروں اور ایکٹرسوں سے نسیم کو بات چیت کی ممانعت ہے۔ ویسے نسیم بھی چھچھوروں سے نفرت کرتی ہے۔ شور و غل برپا کرنے والی پارٹیوں سے وہ خود بھی دور رہتی ہے۔ لیکن ایک دفعہ اُسے ایک بہت بڑے ہنگامے میں حصّہ لینا پڑا۔

یہ ہنگامہ ہولی کا ہنگامہ تھا۔ جس طرح علی گڈھ یونیورسٹی کی ایک "ٹریڈیشن" برکھا کے آغاز پر "مڈ پارٹی" ہے۔ اسی طرح بمبئی ٹاکیز کی ایک ٹریڈیشن ہولی کی رنگ پارٹی تھی۔ چونکہ فلستان کے قریب قریب تمام کارکن بمبئی ٹاکیز کے مہاجر تھے اس

لئے یہ ٹریڈیشن یہاں بھی قائم رہی۔

ایس مکرجی اس رنگ پارٹی کے رنگ لیڈر تھے۔ عورتوں کی کمان ان کی موٹی اور ہنس مکھ بیوی (اشوک کی بہن) کے سپرد تھی۔ میں شاہد لطیف کے ہاں بیٹھا تھا۔ شاہد کی بیوی عصمت (چغتائی) اور میری بیوی (صفیہ) دونوں خدا معلوم کیا باتیں کر رہی تھیں۔ ایک دم شور برپا ہوا۔ عصمت چلائی، "لو صفیہ وہ آ گئے۔ لیکن میں بھی....."

عصمت اس بات پر اڑ گئی۔ کہ وہ کسی کو اپنے اوپر رنگ پھینکنے نہیں دے گی۔ مجھے ڈر تھا کہ اس کی یہ ضد کہیں دوسرا رنگ اختیار نہ کر لے۔ کیونکہ رنگ پارٹی والے سب "ہولی ڈے موڈ" میں تھے۔ خدا کا شکر ہے کہ عصمت کا موڈ خود بخود بدل گیا اور وہ چند لمحات ہی میں رنگوں میں لت پت بھتنی بن کر دوسری بھتنیوں میں شامل ہو گئی۔ میرا اور شاہد لطیف کا حلیہ بھی وہی تھا۔ جو ہولی کے دوسرے بھتوں کا تھا۔

پارٹی میں جب کچھ اور لوگ شامل ہوئے تو شاہد لطیف نے بہ آوازِ بلند کہا۔ "چلو پری چہرہ نسیم کے گھر کا رُخ کرو۔"

رنگوں سے مسلح گروہ گھوڑبندر روڈ کی اونچی نیچی تارکول لگی سطح پر بے ڈھنگے بیل بوٹے بناتا اور شور مچاتا نسیم کے بنگلے کی طرف روانہ ہوا۔ چند منٹوں ہی میں ہم سب وہاں تھے۔ شور سن کر نسیم اور احسان باہر نکلے۔ نسیم ہلکے رنگ کی جارجٹ کی ساڑھی میں ملبوس میک اپ کی نوک پلک نکالے جب ہجوم کے سامنے برآمدے میں نمودار ہوئی، تو شاہد نے یلغار کا حکم دیا۔ مگر میں نے اسے روکا۔ "ٹھہرو! پہلے ان سے کہو کپڑے بدل آئیں۔"

نسیم سے کپڑے تبدیل کرنے کے لئے کہا گیا۔ تو وہ ایک ادا کے ساتھ مسکرائی

یہی ٹھیک ہے۔"

ابھی یہ الفاظ اس کے منہ ہی میں تھے کہ ہولی کی پچکاریاں برس پڑیں۔ چند
ں ہی میں پری چہرہ نسیم بانو ایک عجیب و غریب قسم کی خوف ناک چڑیل میں
یل ہو گئی۔ نیلے پیلے رنگوں کی تہوں میں سے جب اس کے سفید اور چمکیلے
ت اور بڑی بڑی آنکھیں نظر آتیں، تو ایسا معلوم ہوتا کہ بہزاد اور مانی کی
ری پر کسی بچے نے سیاہی انڈیل دی ہے۔

رنگ بازی ختم ہونے پر کبڈی شروع ہوئی۔ پہلے مردوں کا میچ شروع
پھر عورتوں کا۔ یہ بہت دلچسپ تھا۔ مسز مکرجی کی فربہ بیوی جب بھی گرتی،
وں کا طوفان برپا ہو جاتا۔ میری بیوی عینک پوش تھی شیشے رنگ آلود
نے کے باعث اُسے بہت کم نظر آتا تھا۔ چنانچہ وہ اکثر غلط سمت دوڑنے لگتی۔
سے بھاگا نہیں جاتا تھا۔ وہ یہ ظاہر کرنا چاہتی تھی، کہ وہ اس مشقت کی عادی
۔ بہر حال وہ برابر کھیل میں دلچسپی لیتی رہی۔

نسیم اور اس کے میاں بڑے مذہبی قسم کے آدمی ہیں۔ میرا مطلب اس قسم کے
ن آدمیوں سے ہے۔ جو اردو کے اخباروں کے پُرزے زمین سے اُٹھا کر چومتے ہیں
ر آنکھوں پر لگاتے ہیں۔ شام کو ایک ستارہ دیکھتے ہیں، تو اور دو دیکھنے
ئے سارا آسمان کھنگالنا شروع کر دیتے ہیں۔ دونوں توہم پرست ہیں۔ خاص
ر میاں احسان، ریس کورس پر ان کی حالت دیکھنے والی ہوتی ہے۔ پاس
چھی ٹپ ہے۔ قریب ہے کہ اس پر روپیہ لگا دیں۔ کہ ایک کانا آدمی پاس
ر گیا۔ بس وہیں رُک جائیں گے۔ ٹپ کا گھوڑا ون آجائے گا تو نسیم سے الجھ
یں گے۔ "تم نے کیوں کہا تھا کہ اس گھوڑے پر نہ لگانا ـــ نہیں آئے گا"

ایسی ہنگی ہنگی چخ چخ ان میں مدام ہوتی رہتی تھی۔ جو ان کی ازدواجی زندگی میں

رنگ بھرتی رہتی ہے۔

نسیم کے دو بچے ہیں جو اکثر نانی کے پاس رہتے ہیں۔ وہ ان کو ا
فضا سے دور رکھنا چاہتی ہے۔ اس کو اپنے مرحوم باپ سے بہت پیار ہے۔
فوٹو ہر وقت اس کے وینٹی بیگ میں موجود رہتا ہے۔ مجھے عورتوں کی
چوری چوری دیکھنے کا بہت شوق ہے۔ ایک روز میں حسب عادت نسیم
کھول کر یہ فوٹو دیکھ رہا تھا کہ وہ آگئی۔ میں نے اس سے کہا۔ "معاف کیجئے
یہ میری بہت بُری عادت ہے —— بتایئے یہ کس کا فوٹو ہے۔"

نسیم نے فوٹو ہاتھ میں لے کر اس کو پیار بھری نظروں سے دیکھا اور
"میرے ابّا جی کا۔"

مجھے ایسا محسوس ہوا کہ ایک چھوٹی سی بچّی ہے۔ جو مجھ سے یوں کہہ رہی
"میرے ابّا جی کا اور کس کا۔"

میں نے اس سے یہ نہ پوچھا۔ کہ وہ کون ہیں؟ کہاں ہیں؟ —— کیا کرتے
نہ تھا کہ وہ اس کے باپ ہیں —— نہیں —— اس کے ابّا جی ہیں۔"

ذیل کا یہ واقعہ بیان کرنے کے بعد میں یہ مضمون ختم کر دوں گا۔

"بیگم" لکھنے کے دوران میں مسٹر مکرجی کے ساتھ ایک منظر پر بحث
کرتے کرتے بہت دیر ہو گئی۔ رات کے دو بجے تھے۔ صبح کی پہلی گاڑی سات
بجے ملتی تھی۔ میری بیوی ساتھ تھی۔ جب ہم نے رخصت چاہی تو نسیم نے کہا
صفیہ یہیں ٹھہر جاؤ۔ یہ بھی کوئی وقت ہے جانے کا۔"

ہم نے بہت کہا کہ کوئی بات نہیں، موسم اچھا ہے۔ کچھ دیر پلیٹ فا
ٹہلیں گے۔ اتنے میں گاڑی آجائے گی۔ مگر نسیم اور احسان نے بہت اص
کہ ہم ٹھہر جائیں۔ مکرجی چلے گئے۔ اس لئے کہ ان کے پاس موٹر تھی۔ اور

ں جانا تھا۔ میں باہر برآمدے میں سو گیا۔ احسان وہیں کمرے میں صوفے پر
لئے۔

صبح ناشتہ کر کے جب میں اور صفیہ گھر چلے تو راستے میں اس نے مجھے یہ بات
جو دلچسپی سے خالی نہیں۔

جب صفیہ اور نسیم سونے کے لئے کمرے میں داخل ہوئیں تو وہاں ایک پلنگ
صفیہ نے اِدھر اُدھر دیکھا اور نسیم سے کہا۔

"آپ سو جایئے"

نسیم مسکرائی۔ اور پلنگ پر نئی چادر بچھا کر کہنے لگی "کپڑے تو بدل لیں"
یہ کہہ کر اس نے ایک نیا سلیپنگ سوٹ نکالا۔ "یہ تم پہن لو ــــ بالکل
ے"

"بالکل نیا" پر زور تھا جس کا مطلب میری بیوی سمجھ گئی۔ اور لباس
کر کے بستر پر لیٹ گئی۔ نسیم نے اطمینان سے آہستہ آہستہ شب خوابی کا لباس
چہرے کا میک اپ اُتارا۔ تو صفیہ نے حیرت زدہ ہو کر کہا۔ "ہائے، تم کتنی پیلی
ہم!"

نسیم کے پھیکے ہونٹوں پر مسکراہٹ نمودار ہوئی۔ "یہ سب میک اَپ کی
ستانی ہے"

میک اَپ اُتارنے کے بعد اُس نے چہرے پر مختلف روغنیات ملے۔ اور
ہو کر قرآن اُٹھایا۔ اور تلاوت شروع کر دی۔ میری بیوی بے حد متاثر
بے اختیار اس کے مُنہ سے نکلا۔ "نسیم ــــ خدا کی قسم، تم تو ہم لوگوں سے
اچھی ہو۔۔۔"

اس احساس سے کہ یہ بات اس نے ڈھنگ سے نہیں کہی، صفیہ ایکدم

خاموش ہو گئی۔

قرآن کی تلاوت کرنے کے بعد نسیم سو گئی۔

پری چہرہ نسیم ـــــ پکار کی نور جہاں ـــــ ملکۂ حسن ـــــ ار
روشن ـــــ چھمیاں کی بیٹی اور دو بچوں کی ماں!

# معصوم ادائیں لہرغمزے

نجم الحسن جب دیوکا رانی کو لے اُڑا۔ تو بمبئی ٹاکیز میں افراتفری پھیل گئی۔ فلم کا آغاز ہو چکا تھا۔ چند مناظر کی شوٹنگ پایہ تکمیل کو پہنچ چکی تھی۔ کہ نجم الحسن اپنی ہیروئن کو سلولائیڈ کی دنیا سے کھینچ کر حقیقت کی دنیا میں لے گیا۔ بمبئی ٹاکیز میں سب سے زیادہ پریشان اور متفکر شخص ہمانسو رائے تھا۔ دیوکا رانی کا شوہر اور بمبئی ٹاکیز کا "دل و دماغ پسِ پردہ!"

ایس مکرجی مشہور جوبلی میکر فلم ساز (اشوک کمار کے بہنوئی) ان دِنوں بمبئی ٹاکیز میں مسٹر ساورک واچا ساؤنڈ انجینیر کے اسسٹنٹ تھے۔ صرف بنگالی ہونے کی وجہ سے انہیں ہمانسو رائے سے ہمدردی تھی۔ وہ چاہتے تھے کہ کسی نہ کسی طرح دیوکا رانی واپس آجائے۔ چنانچہ انہوں نے اپنے آقا ہمانسو رائے سے مشورہ کئے بغیر اپنے طور پر کوشش کی۔ اور اپنی مخصوص حکمتِ عملی سے دیوکا رانی کو آمادہ کر لیا کہ وہ کلکتے میں اپنے عاشق نجم الحسن کی آغوش چھوڑ کر واپس بمبئی ٹاکیز کی آغوش میں چلی آئے۔ جس میں اس کے جوہر کے پنپنے کی زیادہ گنجائش تھی۔

دیوکا رانی واپس آگئی۔ ایس مکرجی نے اپنے جذباتی آقا ہمانسو رائے کو بھی اپنی حکمتِ عملی سے آمادہ کر لیا کہ وہ اسے قبول کر لیں۔ اور بے چارہ نجم الحسن ان

عاشقوں کی فہرست میں داخل ہو گیا۔ جن کو سیاسی، مذہبی اور سرمایہ دارانہ حکمت عملیوں نے اپنی محبوباؤں سے جدا کر دیا تھا۔

زیرِ تکمیل فلم سے نجم الحسن کو قینچی سے کاٹ کر ردّی کی ٹوکری میں پھینک تو دیا گیا، مگر اب یہ سوال درپیش تھا، کہ عشق آشنا دیوکا رانی کے لئے سیلولائڈ کا ہیرو کون ہو۔

ہمانسو رائے ایک بے حد محنتی اور دوسروں سے الگ تھلگ رہ کر خاموشی سے اپنے کام میں شب و روز منہمک رہنے والے فلم ساز تھے۔ انہوں نے بمبئی ٹاکیز کی نیو کچھ اس طرح ڈالی تھی، کہ وہ ایک باوقار درس گاہ معلوم ہو۔ یہی وجہ ہے کہ انہوں نے بمبئی شہر سے دور مضافات میں ایک گاؤں کو جس کا نام "ملاد" ہے۔ اپنی فلم کمپنی کے لئے منتخب کیا تھا ـــــ وہ باہر کا آدمی نہیں چاہتے تھے۔ اس لئے کہ باہر کے آدمیوں کے متعلق ان کی رائے اچھی نہیں تھی ـــ (نجم الحسن بھی باہر کا آدمی تھا)

یہاں پھر ایس مکرجی نے اپنے جذباتی آقا کی مدد کی۔ ان کا سالا اشوک کمار بی، ایس، سی پاس کر کے ایک برس کلکتے میں وکالت پڑھنے کے بعد بمبئی ٹاکیز کی لیبارٹری میں بغیر تنخواہ کے کام سیکھ رہا تھا۔ ناک نقشہ اچھا تھا۔ تھوڑا بہت گا بجا بھی لیتا تھا۔ چنانچہ مکرجی نے برسبیلِ تذکرہ ہیرو کے لئے اس کا نام لیا۔ ہمانسو رائے کی ساری زندگی تجربوں سے دوچار رہی تھی۔ انہوں نے کہا۔ دیکھ لیتے ہیں۔ جرمن کیمرہ مین ورشنگ نے اشوک کا ٹیسٹ لیا۔ ہمانسو رائے نے دیکھا اور پاس کر دیا۔ جرمن فلم ڈائرکٹر فرانز اوسٹن کی رائے ان کے برعکس تھی۔ مگر بمبئی ٹاکیز میں کس کی مجال کہ ہمانسو رائے کی رائے کے خلاف اظہارِ خیال کر سکے۔ چنانچہ اشوک کمار گانگولی جو اُن دنوں بمشکل بائیس برس کا ہو گا، دیوکا رانی کا ہیرو منتخب ہو گیا۔

ایک فلم بنا، دو فلم بنے ۔۔۔۔ کئی فلم بنے اور دیویکا رانی اور اشوک کمار کا نہ جُدا ہونے والا فلمی جوڑا بن گیا۔ ان فلموں میں سے اکثر بہت کامیاب ہوئے گڑیا سی دیوکا رانی، اور بڑا ہی بے ضرر اشوک کمار، دونوں سیلولائیڈ پر شیر و شکر ہو کر آتے تو بہت ہی پیارے لگتے۔ معصوم ادائیں، الھڑ غمزے ۔۔۔۔ بڑا ہی اہنسائی قسم کا عشق ۔۔۔۔ لوگوں کو جو جارحانہ عشق کرنے اور دیکھنے کے شوقین تھے۔ یہ نرم و نازک اور لچکیلا عشق بہت پسند آیا۔ خاص طور پر اس نئے فلمی جوڑے کی گرویدہ ہو گئے۔ اسکولوں اور کالجوں میں طالبات کا (خصوصاً ان دنوں) آئیڈیل ہیرو اشوک کمار تھا۔ اور کالج کے لڑکے لمبی اور کھلی آستینوں والے بنگالی کرتے پہن کر گاتے پھرتے تھے

تو بن کی چڑیا۔ میں بن کا پنچھی بن بن بولوں رے

میں نے اشوک کے چند فلم دیکھے۔ دیوکا رانی اس کے مقابلہ میں جہاں تک کردار نگاری کا تعلق ہے۔ میلوں آگے تھی۔ اور ہیرو کے روپ میں اشوک ایسا معلوم ہوتا تھا کہ چوکولیٹ کا بنا ہے۔ مگر آہستہ آہستہ اُس نے پر پُرزے نکالے۔ اور بنگال کے آدرش افیمی عشق کی پینک سے بیدار ہونے لگا۔

اشوک جب لیبارٹری کی چلمن سے باہر نکل کر نقرئی پردے پر آیا تو اس کی تنخواہ پچھتر روپے مقرر ہوئی۔ اشوک بہت خوش تھا۔ ان دنوں اکیلی جان کے لئے اور وہ بھی شہر سے دور دراز گاؤں "ملاد" میں اتنے روپے کافی تھے۔ جب اس کی تنخواہ ایک دم دُگنی ہو گئی یعنی ایک سو پچاس روپے ماہوار تو وہ اور بھی زیادہ خوش تھا لیکن جب ڈیڑھ کے ڈھائی مقرر ہوئے تو وہ گھبرا گیا۔ اس نے مجھے اس وقت کی کیفیت بیان کرتے ہوئے کہا۔ "بائی گوڈ ۔۔۔۔ میری حالت عجیب و غریب تھی۔ ڈھائی سو روپے ۔۔۔۔ میں نے کیشیر سے نوٹ لئے تو میرا ہاتھ کانپنے لگا۔ سمجھ میں نہیں آتا تھا، کہ اتنے روپے کہاں رکھوں گا ۔۔۔۔ میرا گھر تھا ۔۔۔۔ ایک چھوٹا سا کوارٹر۔ ایک چارپائی

تھی۔ دو تین کرسیاں، چاروں طرف جنگل —— رات کو اگر کوئی چور آجائے، —— یعنی اگر اس کو معلوم ہو جائے کہ میرے پاس ڈھائی سو روپے ہیں تو کیا ہو، —— میں ایک عجیب چکر میں پڑ گیا۔ چوری ڈکیتی سے میری جان جاتی تھی۔ گھر آکر بہت اسکیمیں بنائیں۔ آخر یہ کیا کہ وہ نوٹ چارپائی کے نیچے بچھی ہوئی دری میں چھپا دئے۔ —— ساری رات بڑے ڈراؤنے خواب آتے رہے۔ صبح اٹھ کر میں نے پہلا کام یہ کیا کہ وہ نوٹ اٹھا کر ڈاک خانے میں جمع کرا دئے"۔

اشوک مجھے یہ بات اپنے مکان پر سُنا رہا تھا کہ کلکتے کا ایک فلم ساز اس سے ملنے آیا۔ کنٹریکٹ تیار تھا۔ مگر اشوک نے اس پر دستخط نہ کیے۔ وہ اسی ہزار روپے دیتا تھا اور اشوک کمار کا مطالبہ پورے ایک لاکھ کا تھا —— کہاں ڈھائی سو روپے اور کہاں ایک لاکھ!

بمبئی ٹاکیز میں اشوک کے ساتھ ساتھ اس کے بہنوئی، ایس مکرجی نے بھی ترقی کی۔ آدمی ذہین تھا —— گرد و پیش جو کچھ بھی ہوتا تھا اس کا بنظرِ غائر مطالعہ کرتا تھا۔ آہستہ آہستہ پروڈیوسر بن گیا —— معمولی پروڈیوسر نہیں، بہت بڑا پروڈیوسر۔ جس نے بمبئی ٹاکیز کے جھنڈے تلے کئی سلور اور گولڈن جوبلی فلم بنائے۔ اور منظر نگاری میں ایک خاص اسکول کی بنیاد ڈالی —— راقم الحروف اس صنف میں اس کو اپنا استاد مانتا ہے۔

اشوک کی دلعزیزی دن بدن بڑھتی چلی گئی۔ چونکہ وہ باہر بہت کم نکلتا تھا اور الگ تھلگ رہتا تھا۔ اس لئے جب لوگ کہیں اس کی جھلک دیکھ پاتے، تو ایک ہنگامہ برپا ہو جاتا۔ چلتی ٹریفک بند ہو جاتی۔ اس کے چاہنے والوں کے ٹھٹھ لگ جاتے۔ اور اکثر اوقات پولیس کے ڈنڈے کے زور سے اُسے ہجوم کی بے پناہ عقیدت سے نجات دلانا پڑتی۔

اشوک اپنے عقیدت مندوں کے والہانہ اظہار کو وصول اور برداشت کرنے کے معاملے میں بہت ہی ذلیل واقع ہوا ہے۔ فوراً ہی چڑھ جاتا ہے۔ جیسے کسی نے گالی دی ہے۔ میں نے اس سے کئی دفعہ کہا "دادامنی۔ تمہاری یہ حرکت بڑی واہیات ہے ـــ خوش ہونے کی بجائے تم ناراض ہوتے ہو۔ کیا تم اتنا بھی نہیں سمجھتے، کہ یہ لوگ تم سے محبت کرتے ہیں۔" لیکن یہ بات سمجھنے کے لئے شاید اس کے دماغ میں کوئی ایسا خانہ ہی نہیں ہے۔

محبت سے وہ قطعاً نا آشنا ہے (یہ تقسیم سے پہلے تک کی بات ہے۔ اس عرصے میں اس کے اندر کیا تبدیلیاں پیدا ہوئی ہیں۔ ان کے متعلق میں کچھ نہیں کہہ سکتا سینکڑوں حسین لڑکیاں اس کی زندگی میں آئیں۔ مگر وہ نہایت ہی روکھے انداز میں ان کے ساتھ پیش آیا۔ طبعاً وہ ایک ٹھیٹ جاٹ ہے۔ اس کے کھانے پینے اور رہنے سہنے میں ایک عجیب قسم کا گنوارپن ہے۔

دیوکا رانی نے اس سے عشق کرنا چاہا۔ لیکن اس نے بہت ہی غیر صناعانہ انداز میں اس کی حوصلہ شکنی کی۔ ایک اور ایکٹریس نے جرأت سے کام لے کر اس کو اپنے گھر بلایا۔ اور بڑے ہی نرم و نازک طریقے سے اس پر اپنی محبت کا اظہار کیا۔ مگر جب اشوک نے بڑے بینڈے پن سے اس کا دل توڑا، تو اس غریب کو پیترہ بدل کر یہ کہنا پڑا۔ "میں آپ کا امتحان لے رہی تھی۔ آپ تو میرے بھائی ہیں۔"

اشوک کو اس ایکٹریس کا جسم پسند تھا۔ ہر وقت دُھلی دُھلی نکھری نکھری رہتی تھی۔ اس کی یہ چیز بھی اشوک کو بہت بھاتی تھی۔ چنانچہ جب اس نے قلابازی لگا کر اس کو اپنا بھائی بنا لیا تو اشوک کو کافی کوفت ہوئی۔

اشوک عشق پیشہ نہیں۔ لیکن تاک جھانک کا مرض اُس کو عام مردوں کا ہے۔ عورتوں کی دعوت طلب چیزوں کو باقاعدہ غور سے دیکھتا ہے۔ اور ان کے

تعلق اپنے دوستوں سے باتیں بھی کرتا ہے۔ کبھی کبھار کسی عورت کی جسمانی
زیبت کی خواہش بھی محسوس کرتا ہے۔ مگر بقول اس کے " منٹو یار ـــــ ہمّت
ہیں پڑتی "۔

ہمت کے معاملے میں وہ واقعی بہت بودا ہے۔ لیکن یہ بودا پن اس کی ازدواجی
زندگی کے لیے بہت ہی مبارک ہے۔ اس کی بیوی شوبھا سے اگر اس کی اس کمزوری
اذکر کیا جائے تو یقیناً وہ یہی کہے گی " خدا کا شکر ہے کہ گانگولی میں ایسی ہمت نہیں
ر خدا کرے اس میں یہ ہمت کبھی پیدا نہ ہو "۔

مجھے حیرت ہے کہ اس میں یہ ہمت اور جرأت کیوں پیدا نہ ہوئی۔ جب کہ
سینکڑوں لڑکیوں نے جرأتِ رندانہ سے کام لے کر اس کو عشق کی آگ میں کودنے
ر ترغیب دی۔ اس کی ذاتی ڈاک میں بلا مبالغہ ہزاروں عورتوں کے عشق و محبت
ے لبریز خطوط آئے ہوں گے۔ مگر جہاں تک میں جانتا ہوں خطوط کے اس انبار
یں سے اس نے شاید ایک سو بھی خود نہیں پڑھے ـــ خط آتے ہیں، اس کا مریل
سکریٹری ڈی سوزا انہیں مزے لے لے کر پڑھتا ہے۔ اور دن بدن مریل
ہوتا جاتا ہے۔

تقسیم سے چند ماہ پہلے اشوک فلم چندر شیکھر کے سلسلے میں کلکتے میں تھا۔
شہید سہروردی (اس وقت وزیرِ اعظم بنگال) کے ہاں سے سولہ ملی میٹر فلم دیکھنے
کے بعد اپنے ڈیرے لوٹ رہا تھا۔ کہ راستے میں دو خوبصورت اینگلو انڈین لڑکیوں
نے اس کی موٹر روکی۔ اور لفٹ چاہی۔ اشوک نے چند منٹ کی یہ عیاشی تو کر لی،
مگر اسے اپنے نئے سگریٹ کیس سے ہاتھ دھونے پڑے۔ ایک لڑکی جو شوخ و شنگ
تھی سگریٹ کے ساتھ سگریٹ کیس بھی لے اڑی۔ اس واقعہ کے بعد اشوک نے کئی
بار سوچا کہ ان سے راہ و رسم پیدا کی جائے۔ بات معمولی تھی، مگر اس کی ہمّت

نہ پڑی۔

کولھاپور میں گرز، تلوار اور ڈھال قسم کا بھاری بھرکم ہونق فلم بن رہا تھا
اشوک کا تھوڑا سا کام اس میں باقی رہ گیا تھا۔ وہاں سے کئی بلاوے آئے مگر وہ
نہ گیا۔ اس کی طبیعت اس رول سے بہت متنفر تھی۔ جو اسے ادا کرنے کے لئے دیا
گیا تھا۔ مگر کنٹریکٹ تھا۔ آخر ایک روز اسے جانا ہی پڑا۔ ساتھ مجھے لے گیا۔ ان دنوں
میں فلمستان کے لئے "آٹھ دن" نامی فلم لکھ رہا تھا۔ چونکہ یہ فلم اسے پروڈیوس
اور ڈائرکٹ کرنا تھی، اس لئے اس نے کہا۔ "چلو یار —— وہاں آرام سے کام کرینگے
مگر آرام کہاں —— لوگوں کو فوراً معلوم ہو گیا کہ اشوک کمار کولھاپور آ
ہے۔ چنانچہ اس ہوٹل کے ارد گرد جہاں ہم ٹھہرے تھے۔ زائرین جمع ہونے شروع ہو گ
ہوٹل کا مالک ہوشیار تھا۔ کسی نہ کسی بہانے وہ ان لوگوں کو منتشر کر دیتا۔ لیکن پھ
بھی بعض چپکو قسم کے لوگ ہوٹل کا طواف کرتے رہتے۔ اور اپنے محبوب ایکٹر کی
زیارت کر ہی لیتے۔ اپنے عقیدت مندوں کے ساتھ اشوک، جیسا کہ میں پہلے کہہ چ
ہوں۔ بہت ہی اکھڑ قسم کا سلوک کرتا رہا۔ مجھے معلوم نہیں ان کا ردِ عمل کیا تھا۔ مگ
بحیثیت ایک ناظر کے مجھے سخت کوفت ہوتی تھی۔

ایک شام ہم دونوں سیر کو نکلے۔ اشوک "کیموفلاز" کئے تھا۔ آنکھوں پر چوڑ
چکلا گہرے رنگ کا چشمہ —— ایک ہاتھ میں چھڑی، دوسرے ہاتھ میں میرا کندھا
تاکہ حسب ضرورت مجھے آگے پیچھے کر سکے۔ اسی طرح ایک اسٹور میں پہنچے۔ اشوک ک
کولھاپور کے اسٹڈیو کے گرد و غبار کے اثرات سے محفوظ رہنے کے لئے کوئی دوا
خریدنا تھی۔ جب اس نے اسٹور والے سے یہ طلب کی تو اس نے سرسری نظر سے
اپنے گاہک کی طرف دیکھا۔ اور الماری کی طرف بڑھا۔ لیکن فوراً ہی "ڈی لیڈ اکٹر"
بمب کی طرح پھٹا۔ اور مڑ کر اشوک سے مخاطب ہوا۔

"آپ کون ہیں؟"

اشوک نے جواب دیا "میں کون ہوں؟ ——— میں وہی ہوں جو کہ میں ہوں"

اسٹور والے نے غور سے اشوک کے چشمہ اوڑھے چہرے کی طرف دیکھا۔

"آپ اشوک کمار ہیں؟"

اشوک نے بڑے دل شکن لہجے میں کہا "اشوک کمار کوئی اور ہوگا۔ چلو منٹو"

یہ کہہ کر اس نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھا۔ اور دوا خریدے بغیر ہی ہم دونوں اسٹور سے باہر تھے۔ ہوٹل کا موڑ مڑنے لگے تو سامنے تین مرہٹی لڑکیاں نمودار ہوئیں بہت صاف ستھری۔ گوری چٹی۔ ماتھے پر کُم کُم، بالوں میں دینیاں (پھولوں کے گجرے) پیروں میں ہلکے ہلکے چپل۔ ان میں سے ایک جس کے ہاتھوں میں موسمبیاں تھیں اشوک کو دیکھ کر زور سے کانپی، بھنچی ہوئی آواز میں اس نے اپنی سہیلیوں سے کہا۔ "اشوک!" اور اس کے ہاتھوں کی ساری موسمبیاں سڑک پر گر پڑیں۔ اشوک نے میرا کندھا چھوڑا اور بھاگ گیا۔

اشوک سے میری پہلی ملاقات فلمستان میں ہوئی، جب ایس مکرجی کی پوری ٹیم نے بمبئی ٹاکیز چھوڑ کر اپنا نیا فلمی ادارہ قائم کر لیا تھا۔ یوں تو میں نے کئی بار اس کی جھلکیاں دیکھی تھیں، مگر اس سے مفصل ملاقات فلمستان ہی میں ہوئی۔ جب میں وہاں ملازم ہو گیا۔

فلمی دنیا کی ہر شخصیت پردے پر کچھ اور، پردے سے دور کچھ اور ہی ہوتی ہے چنانچہ اشوک کو جب میں نے پہلی بار دیکھا، تو پردے کے اشوک سے بہت ہی مختلف تھا۔ گہرا سانولا رنگ۔ موٹے اور کھردرے ہاتھ، مضبوط کسرتی جسم، نیم گنوار لب و لہجہ۔ اکھڑا اکھڑا غیر فطری تکلف۔ تعارف کرایا گیا، تو میں نے اس سے

کہا۔ "آپ سے مل کر بڑی مسرت ہوئی ہے"۔

اشوک نے اس کے جواب میں جو کچھ کہا۔ وہ موٹے موٹے الفاظ پر مشتمل تھا۔ ایسا لگتا تھا۔ جیسے اس نے یہ لفظ رٹے ہوئے ہیں۔

ایک مرتبہ فلمستان میں ایک صاحب سیر و تفریح کے لئے آئے۔ آپ نے بڑے پُر تکلف انداز میں اشوک سے کہا۔ "مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ خاکسار کو اس سے پہلے بھی جناب سے شرف ملاقات حاصل ہو چکا ہے"۔

اشوک نے گڈ مڈ لہجے میں جواب دیا۔ "جی .... جی مجھے کبھی مقابلہ نہیں ہوا"۔ مقابلے کا قاف اُس نے حلق سے نکالا... لیکن فوراً ہی اس کو احساس ہوا کہ اس نے یہ لفظ غلط استعمال کیا ہے۔ مگر وہ گول کر گیا۔

اشوک کو اردو بہت اچھی لگتی ہے۔ شروع شروع میں اس نے اس زبان میں لکھنا پڑھنا شروع کیا۔ مگر قاعدے سے آگے نہ بڑھ سکا۔ پھر بھی اس کو تھوڑی سی شُدبُد ہے۔ ایک دو سطر اردو میں لکھ لیتا ہے۔ تقسیم کے بعد جب میں اُسے چھوڑ کر بمبئی ٹاکیز سے چلا آیا۔ تو اس نے مجھے اردو میں ایک خط لکھا۔ کہ واپس آجاؤ مگر افسوس ہے کہ میں اسے چند در چند وجوہ کے باعث اس کا جواب نہ دے سکا۔

میری بیوی بھی دوسری عورتوں کی طرح اشوک کمار کی مداح تھی۔

ایک دن میں اشوک کو اپنے گھر لے آیا۔ کمرے میں داخل ہوتے ہی میں نے زور سے آواز دی۔ "صفیہ — آؤ اشوک کمار آیا ہے"۔

صفیہ اندر روٹی پکا رہی تھی۔ جب میں نے پے در پے آوازیں دیں، تو وہ باہر نکلی۔ میں نے اشوک کمار سے اس کا تعارف کرایا۔ "یہ میری بیوی ہے۔ دادامنی — ہاتھ ملاؤ اس سے"۔

صفیہ اور اشوک دونوں جھینپ گئے۔ میں نے اشوک کا ہاتھ پکڑ لیا۔ "ہاتھ

ملاؤ دادامنی ـــ شرماتے کیا ہو۔"

مجبوراً اُسے ہاتھ ملانا پڑا۔ اتفاق سے اس روز قیمے کی روٹیاں تیار کی جارہی تھیں۔ اشوک کھاکے آیا تھا۔ مگر جب کھانے پر بیٹھا تو تین پراٹھے کرگیا۔

یہ عجیب بات ہے کہ بمبئی میں اس کے بعد جب کبھی ہمارے یہاں قیمے کی روٹیاں تیار ہوتیں اشوک کسی نہ کسی طرح آن موجود ہوتا۔ اس کی توجیہہ میں کرسکتا ہوں، نہ اشوک۔ دانے دلنے پر مہر والا ہی قصہ معلوم ہوتا ہے۔

میں نے ابھی ابھی اشوک کو دادامنی کہا ہے۔ بنگلہ میں اس کا مطلب ہے بڑا بھائی ـــ اشوک سے جب میرے مراسم بڑھ گئے، تو اس نے مجھے مجبور کیا، کہ میں اُسے دادامنی کہا کروں۔ میں نے اس سے کہا۔ "تم بڑے کیسے ہوئے۔ حساب کرلو، میں عمر میں تم سے بڑا ہوں۔"

حساب کیا گیا تو وہ مجھ سے عمر میں دو ماہ اور کچھ دن بڑا نکلا۔ چنانچہ اشوک اور مسٹر گانگولی کے بجائے مجھے دادامنی کہنا پڑا۔ یہ مجھے پسند بھی تھا۔ کیونکہ اس میں بنگالیوں کی محبوب مٹھاس "رس گلے" کی مٹھاس اور گولائی تھی۔ وہ مجھے پہلے "مسٹر منٹو" کہتا تھا۔ جب اس سے دادامنی کہنے کا معاہدہ ہوا تو وہ مجھے صرف منٹو کہنے لگا۔ حالانکہ مجھے یہ ناپسند تھا۔

پردے پر وہ مجھے چاکولیٹ ہیرو معلوم ہوتا تھا۔ مگر جب میں نے اس کو سلولائڈ کے خول سے باہر دیکھا، تو وہ ایک کسرتی آدمی تھا۔ اس کے مکے میں اتنی قوت تھی کہ دروازے کی لکڑی میں شگاف پڑ جاتا تھا۔ ہر روز گھر پر باکسنگ کی مشق کرتا تھا۔ شکار کھیلنے کا شوقین تھا۔ سخت سے سخت کام کرسکتا تھا۔ افسوس مجھے صرف اس بات کا ہوا کہ اُسے آرائش کا قطعاً ذوق نہیں تھا۔ وہ اگر چاہتا تو اس کا گھر دلکش سے دلکش ساز و سامان سے آراستہ ہوتا۔ مگر اس طرف وہ کبھی توجہ دیتا ہی نہیں تھا۔

اور اگر دیتا تھا تو اس کے نتائج غیر صناعانہ ہوتے تھے۔ برش اٹھا کر خود ہی سارے فرنیچر پر گہرا نیلا پینٹ تھوپ دیتا۔ یا کسی صوفے کی پشت توڑ کر اسے دیوان کی بھونڈی شکل میں تبدیل کر دیا۔

مکان سمندر کے ایک غلیظ کنارے پر ہے۔ نمکین پانی کے چھینٹے باہر کھڑکیوں کی سلاخوں کو چاٹ رہے ہیں۔ جگہ جگہ لوہے کے کام پر زنگ کی پپڑیاں جمع ہیں۔ ان سے بڑی اداسی پھیلانے والی بو آ رہی ہے۔ مگر اشوک اس سے قطعاً غافل ہے۔ ریفریجریٹر باہر کوری ڈور میں پڑا جھک مار رہا ہے۔ اس کے ساتھ لگ کر اس کا گرانڈیل ایلسیشین کتا سو رہا ہے۔ پاس کمرے میں بچے اودھم مچا رہے ہیں۔ اور اشوک غسل خانے کے اندر پاٹ پر بیٹھا دیواروں پر حساب لگا کر دیکھ رہا ہے۔ کہ ریس میں کون سا گھوڑا دِن آئے گا۔ یا مکالموں کا پرچہ ہاتھ میں لئے ان کی ادائیگی سوچ رہا ہے۔ اشوک کو فراست الید یعنی پامسٹری اور علمِ نجوم سے خاص شغف ہے۔ مؤخر الذکر علم اس نے اپنے باپ سے سیکھا ہے۔ متعدد کتابیں بھی پڑی ہیں۔ فرصت کے اوقات میں وہ شغل کے طور پر اپنے دوستوں کی جنم پتریاں دیکھا کرتا ہے۔

میرے ستاروں کا مطالعہ کر کے اس نے ایک دن مجھ سے سرسری طور پر پوچھا "تم شادی شدہ ہو؟"

میں نے اس سے کہا۔ "تمہیں معلوم نہیں؟"

اس نے کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد کہا۔ "جانتا ہوں ـــ لیکن دیکھو منٹو، ایک بات بتاؤ ـــ نہیں ـــ تمہارے تو ابھی اولاد نہیں ہوئی۔"

میں نے اس سے پوچھا۔ "بات کیا ہے ـــ بتاؤ تو سہی۔"

اس نے ہچکچاتے ہوئے کہا۔ "کچھ نہیں ـــ جن لوگوں کے ستاروں کی یہ

پوزیشن ایسی ہوتی ہے ان کی پہلی اولاد لڑکا ہوتی ہے ..... مگر وہ زندہ نہیں نہیں رہتی۔"

اشوک کو یہ معلوم نہیں تھا کہ میرا لڑکا ایک سال کا ہو کر مر گیا تھا۔

اشوک نے مجھے بعد میں بتایا کہ اس کا پہلا بچہ جو کہ لڑکا تھا۔ مردہ پیدا ہوا تھا

اس نے مجھ سے کہا۔ تمہارے اور میرے ستاروں کی پوزیشن قریب قریب ایک جیسی ہے۔ اور یہ ہو ہی نہیں سکتا کہ جن لوگوں کے ستاروں کی پوزیشن ایسی ہو۔ ان کے ہاں پہلی اولاد لڑکا نہ ہو اور وہ نہ مرے۔

اشوک کو علم نجوم کی صحت پر پورا پورا یقین ہے۔ بشرطیکہ حساب درست ہو وہ کہا کرتا ہے "جس طرح ایک پائی کی کمی بیشی حساب میں بہت بڑی گڑبڑ پیدا کر دیتی ہے۔ اسی طرح ستاروں کے حساب میں معمولی سی غلطی ہمیں کہیں کی کہیں لے جاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وثوق کے ساتھ کوئی نتیجہ قائم نہیں کرنا چاہیے۔ کیونکہ ہو سکتا ہے ہم سے سہو ہو گیا ہو۔"

ریس کے گھوڑوں کے ٹپ حاصل کرنے میں بھی عام طور پر اشوک ایسے علم سے مدد لیتا ہے۔ گھنٹوں باتھ روم میں بیٹھا حساب لگاتا رہتا ہے۔ مگر پوری ریس میں سو روپے سے زیادہ اس نے کبھی نہیں کھیلا۔ اور یہ عجیب اتفاق ہے کہ وہ ہمیشہ جیتتا ہے۔ سو کے ایک سو دس ہو گئے۔ سو کے سو ہی رہے۔ مگر ایسا کبھی نہیں ہوا کہ اس کے سو میں سے ایک پائی کم ہوئی ہو ——— وہ ریس جیتنے کے لئے نہیں، محض تفریح کے لئے کھیلتا ہے۔ اس کی حسین و جمیل بیوی شوبھا تین بچوں کی ماں ہمیشہ اس کے ساتھ ہوتی ہے۔ ممبرز انکلوژر میں داخل ہوتے ہی وہ ایک کونے میں الگ تھلگ بیٹھ جاتا ہے۔ ریس شروع ہونے سے چند منٹ پہلے اپنی بیوی کو روپیہ دیتا ہے کہ فلاں فلاں نمبر کے ٹکٹ لے لو۔ جب ریس ختم ہوتی ہے تو ا

بیوی ہی کھڑکی پر جاکر جیتنے والے ٹکٹوں کے روپے وصول کرتی ہے۔

شوبھا گھریلو عورت ہے۔ تعلیم واجبی ہے۔ اشوک کہا کرتا ہے کہ اَن پڑھ ہے مگر صرف ازراہِ مذاق۔ اس کی ازدواجی زندگی بہت کامیاب ہے۔ شوبھا اتنی دولت ہونے کے باوجود گھر کے کام کاج میں مشغول رہتی ہے۔ ٹھیٹ بنگالیوں کی طرح سوتی دھوتی پہنے اور اس کے پلّو کے ایک کونے میں چابیوں کا یہ بڑا گچھا اُڑسے وہ مجھے ہمیشہ اپنے گھر میں مصروفِ کار نظر آئی۔ شام کو جب کبھی وسکی کا ایک دَور چلتا، تو گزک کی چیزیں شوبھا اپنے ہاتھ سے تیار کرتی تھی۔ کبھی نمکین پارے کبھی بُھنی ہوئی دال۔ کبھی آلوؤں کے قتلے۔

میں ذرا زیادہ پینے کا عادی تھا۔ اس لئے شوبھا اشوک سے کہتی تھی "دیکھو گانگولی! مسٹر منٹو کو زیادتی مت دینا۔ مسز منٹو ہم کو بولیں گی"۔

مسز منٹو اور مسز گانگولی دونوں سہیلیاں تھیں۔ ان سے ہم دونوں بہت کام نکالتے تھے۔ جنگ کے باعث بڑے اچھے سگریٹ قریب قریب ناپید تھے۔ جتنے بھی باہر سے آتے تھے سب کے سب بلیک مارکیٹ میں چلے جاتے تھے۔ یوں تو ہم عام طور پر اس بلیک مارکٹ ہی سے اپنے لئے سگریٹ حاصل کرتے تھے۔ مگر جب کسی وسیلے سے صحیح قیمت پر کوئی چیز مل جاتی، تو ہم عجیب و غریب مسرّت محسوس کرتے۔

مسز گانگولی جب شوپنگ کرنے نکلتی تو میری بیوی صفیہ کو کبھی کبھی اپنے ساتھ لے جاتی۔ قریب قریب ہر بڑے دُکاندار کو معلوم تھا کہ مسز گانگولی مشہور ایکٹر اشوک کمار کی بیوی ہے، چنانچہ اس سے طلب کرنے پر بلیک مارکٹ کی تاریک تہوں میں چھپائی ہوئی چیزیں باہر نکل آتی تھیں۔ یوں بھی بمبئی کے مرد عورتوں کے معاملے میں کافی نرم دل واقع ہوئے ہیں۔

بنک سے روپیہ نکلوانا ہو، کوئی رجسٹری کرانا ہو، سینما یا ریل گاڑی کے ٹکٹ لینا ہوں۔ مرد پڑا ڈیڑھ گھنٹہ سوکھتا رہے گا۔ لیکن اس کے مقابلے میں عورت کو ایک منٹ بھی انتظار کرنا نہیں پڑے گا۔

اشوک نے اپنی شہرت اور ہر دلعزیزی سے شاید ہی فائدہ اُٹھایا۔ مگر دوسرے بعض اوقات اس کے علم کے بغیر اس کے ذریعے سے اپنا اُلّو سیدھا کر لیتے تھے۔ راجہ مہدی علی خاں نے ایک دفعہ بڑے ہی دلچسپ طریقے سے اپنا اُلّو سیدھا کیا ——

راجہ فلمستان میں ملازم تھا۔ میں فلمستان چھوڑ کر ولی صاحب کے لئے ایک کہانی لکھ رہا تھا۔ ایک روز مجھے ٹیلیفون پر اشوک کے سکریٹری نے بتایا کہ راجہ مہدی علی خاں بیمار ہیں۔ میں وہاں پہنچا تو دیکھا کہ جناب کی بہت بُری حالت ہے۔ گلا اس قدر خراب ہے کہ آواز ہی نہیں نکلتی۔ نقاہت کا یہ عالم ہے کہ سہارا لے کر بھی اُٹھا نہیں جاتا۔ اور آپ نمکین پانی کے غراروں، اور نیٹل بام کی مالش سے اپنا مرض دور کرنے کی کوشش فرما رہے ہیں۔

مجھے شبہہ سا ہوا، کہیں ڈپتھیریا نہ ہو۔ چنانچہ میں نے انہیں فوراً ہی موٹر میں لادا۔ اور اشوک کو ٹیلیفون کیا۔ اس نے مجھے اپنے ایک واقف ڈاکٹر کا نام بتایا کہ وہاں لے جاؤ۔ میں راجہ صاحب کو وہاں لے گیا۔ تشخیص کے بعد معلوم ہوا کہ واقعی وہی موذی مرض ہے۔ ڈاکٹر صاحب کے مشورے کے مطابق میں نے فوراً ہی متعدی امراض کے ہسپتال میں ان کو داخل کرا دیا۔ ٹیکے وغیرہ دئے گئے۔ دوسرے روز صبح میں نے اشوک کو ٹیلیفون پر راجہ کے مرض کی نوعیت بتائی۔ جب اس نے کوئی تشویش ظاہر نہ کی تو مجھے غصہ آگیا، کہ تم کیسے انسان ہو

ایک آدمی ایسے خوفناک مرض میں مبتلا ہے۔ بے چارے کا یہاں کوئی پرسانِ حال بھی نہیں۔ اور تم کوئی دلچسپی ہی نہیں لے رہے۔

اشوک نے جواباً صرف اس قدر کہا۔ "آج شام کو چلیں گے اس کے پاس۔"

ٹیلیفون بند کر کے میں ہسپتال پہنچا۔ اور دیکھا کہ راجہ کی حالت پہلے کی نسبت کسی قدر بہتر ہے۔ ڈاکٹر نے جو ٹیکے کہے تھے، وہ میں لے آیا تھا۔ یہ اُس کے حوالے کر کے اور دم دلاسہ دے کر میں اپنے کام پر چلا گیا۔

شام کو اشوک نے مجھے وکی کے دفتر میں پکڑ لیا۔ میں ناراض تھا۔ مگر اس نے مجھے منا لیا۔ موٹر میں ہسپتال پہنچے۔ اشوک نے راجہ سے معذرت طلب کی، کہ وہ بے حد مصروف تھا۔ اِدھر اُدھر کی باتیں ہوئیں۔ اس کے بعد اشوک مجھے گھر چھوڑ کر چلا گیا۔

دوسرے روز ہسپتال پہنچا، تو کیا دیکھتا ہوں، راجہ، راجہ بنا بیٹھا ہے۔ بستر کی چادر اُجلی، تکیے کا غلاف اُجلا، سگریٹ کی ڈبیا، پان، سرہانے کی وِنڈو سل پر پھولدان، ٹانگ پر ٹانگ رکھے، ہسپتال کا صاف ستھرا جوڑا پہنے بڑے عیاشانہ طور پر اخبار کا مطالعہ کر رہا تھا، میں نے حیرت بھرے لہجہ میں اس سے پوچھا۔ "کیوں راجہ — یہ سب کیا؟"

راجہ مسکرایا۔ اس کی یہ بڑی بڑی مونچھیں تھرّائیں۔ "یہ تو کچھ بھی نہیں — ابھی اور دیکھنا۔"

میں نے پوچھا۔ "کیا؟"

"عیاشی کے سامان — کچھ روز اور میں یہاں رہا تو تم دیکھو گے، کہ پاس والے کمرے میں میری حرم سرائے ہو گی۔ خدا جیتا رکھے میرے اشوک کمار کو۔ بتاؤ وہ کیوں نہیں آیا؟"

تھوڑی دیر کے بعد راجہ نے بتایا کہ وہ سب کچھ اشوک کا نور ظہور ہے ـــــ ہسپتال والوں کو پتہ چل گیا، کہ اشوک اس کی بیمار پُرسی کے لئے آیا تھا، چنانچہ ہر چھوٹا بڑا راجہ کے پاس آیا۔ ہر ایک نے اس سے ایک ہی قسم کے متعدد سوال کئے۔

"کیا اشوک واقعی اس کی بیمار پرسی کے لئے آیا تھا؟"

"اشوک سے اُس کے کیا تعلقات ہیں؟"

"کیا وہ پھر آئے گا؟"

"کب اور کس وقت آئے گا؟"

راجہ نے ان کو بتایا کہ اشوک اس کا بہت ہی گہرا دوست ہے۔ اس کے لئے اپنی جان تک دینے کو تیار ہے۔ وہ ہسپتال میں اس کے ساتھ ہی رہنے کو تیار تھا۔ مگر ڈاکٹر نہ مانے۔ صبح شام آتا مگر کنٹریکٹ کچھ ایسے ہیں کہ مجبور رہے۔ آج شام کو ضرور آئے گا ـــــ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ خیراتی ہسپتال کے خیراتی کمرے میں اس کو ہر قسم کی سہولت میسّر تھی۔

وقت ختم ہونے پر میں جانے ہی والا تھا کہ میڈیکل اسٹوڈنٹ لڑکیوں کا ایک گروہ کمرے میں داخل ہوا... راجہ مسکرایا۔

"خواجہ ـــــ حرم سرائے کے لئے یہ ساتھ والا کمرہ میرا خیال ہے چھوٹا رہے گا"۔

اشوک بہت اچھا ایکٹر ہے۔ مگر وہ صرف اپنی جان پہچان کے بے تکلف لوگوں کے ساتھ مل کر ہی پوری دل جمعی سے کام کر سکتا ہے۔ یہی وجہ ہے، کہ اُن فلموں میں اس کا کام اطمینان بخش نہیں ہے۔ جو اس کی ٹیم نے نہیں بنائے اپنے لوگوں میں ہو تو وہ کھل کر کام کرتا ہے۔ ڈیکنیشنوں کو مشورے دیتا ہے۔

ان کے مشورے قبول کرتا ہے۔ اپنی ایکٹنگ کے متعلق لوگوں سے استفسار کرتا ہے ایک سین کو مختلف شکلوں میں ادا کر کے خود پرکھتا ہے۔ اور دوسروں کی رائے لیتا ہے۔ اس فضا سے اگر کوئی اسے باہر لے جاتا ہے تو وہ بہت الجھن محسوس کرتا ہے۔

تعلیم یافتہ ہونے اور بمبئی ٹاکیز جیسے باذوق فلمی ادارے کے ساتھ کئی برسوں تک منسلک رہنے کی وجہ سے اشوک کو فلمی صنعت کے قریب قریب ہر شعبے سے واقفیت حاصل ہو گئی تھی۔ وہ کیمرے کی باریکیاں جانتا تھا۔ لیبارٹری کے تمام پیچیدہ مسائل سمجھتا تھا۔ ایڈیٹنگ کا عملی تجربہ رکھتا تھا۔ اور ڈائرکشن کی گہرائیوں کا بھی مطالعہ کر چکا تھا۔ فلمستان میں جب اس سے رائے بہادر چونی لال نے ایک فلم پروڈیوس کرنے کے لئے کہا تو وہ فوراً تیار ہو گیا۔

ان دنوں فلمستان کا پروپیگنڈہ فلم "شکاری" مکمل ہو چکا تھا۔ اس لئے میں کئی مہینوں کی لگاتار محنت کے بعد گھر میں چھٹیوں کے مزے اُڑا رہا تھا۔ ایک دن ساوک واچا آئے، اِدھر اُدھر کی باتیں کرنے کے بعد کہنے لگے۔ سعادت ——— ایک کہانی لکھ دو گنگولی کے لئے۔ میری سمجھ میں نہ آیا، کہ ساوک کا کیا مطلب ہے۔ میں فلمستان کا ملازم تھا۔ اور میرا کام ہی کہانیاں لکھنا تھا۔ گنگولی کے لئے کہانی لکھوانے کے لئے ساوک کی سفارش کی کیا ضرورت ہے۔ مجھ سے فلمستان کا کوئی ذمہ دار رُکن بھی کہتا، میں کہانی لکھنا شروع کر دیتا۔ لیکن بعد میں مجھے معلوم ہوا کہ اشوک چونکہ فلم خود پروڈیوس کرنا چاہتا ہے اس لئے اس کی خواہش ہے کہ میں اس کی خواہش کے مطابق کوئی نہایت ہی اچھوتی کہانی لکھوں۔ وہ خود میرے پاس اس لئے نہ آیا کہ وہ دوسروں سے کئی کہانیاں سُن چکا تھا۔

بہر حال ساوک کے ساتھ وقت مقرر ہوا۔ اور ہم سب ساوک ہی کے صاف ستھرے فلیٹ میں جمع ہوئے۔ اشوک کو کیسی کہانی چاہیے تھی۔ یہ خود اس کو معلوم نہیں تھا۔ "بس منٹو ایسی کہانی ہو کہ مزا آجائے ..... اتنا خیال رکھو کہ یہ میرا پہلا فلم ہوگا۔"

ہم سب نے مل کر گھنٹوں مغز پاشی کی۔ مگر کچھ سمجھ میں نہ آیا۔ ان دنوں آغا جان کی ڈائمنڈ جوبلی ہونے والی تھی۔ جس کے لئے ساوک کے فلیٹ کی پرلی طرف بورن اسٹیڈیم میں ایک بہت بڑا پنڈال تعمیر کیا جا رہا تھا۔ میں نے اس سے انسپی ریشن حاصل کرنے کی کوشش کی۔ ساوک کے سٹنگ روم میں صنم تراشی کا ایک نہایت ہی عمدہ نمونہ تھا۔ اس کو بھی دماغ میں گھمایا پھرایا۔ پرانے کارناموں پر نظر ڈالی۔ مگر کوئی نتیجہ برآمد نہ ہوا۔

دن بھر کی سعیٔ ناکام کی کوفت دور کرنے کے لئے شام کو باہر ٹیرس پر برانڈی کا دور شروع ہوا۔ شراب کے انتخاب میں ساوک واقعی بہت ہی عمدہ ذوق کا مالک ہے۔ برانڈی چونکہ ذائقہ اور قوام کی بہت ہی اچھی تھی حلق سے اترتے ہی لطف آگیا۔ سامنے چرچ گیٹ اسٹیشن تھا نیچے بازار میں خوب چہل پہل تھی۔ ادھر بازار کے اختتام پر سمندر اوندھے منہ لیٹا سستا رہا تھا بڑی بڑی قیمتی کاریں سڑک کی چمکیلی سطح پر تیر رہی تھیں۔ تھوڑی دیر کے بعد ایک ہانپتا ہوا سڑکیں کوٹنے والا انجن نمودار ہوا..... میں نے ایسے ہی سوچا ..... خدا معلوم کہاں سے یہ خیال میرے دماغ میں آن ٹپکا کہ اگر اس ٹیرس سے کوئی خوب صورت لڑکی ایک رقعہ گرائے اس نیت سے کہ وہ جس ہاتھ لگے گا وہ اس سے شادی کرے گی تو کیا ہو؟ ..... ہو سکتا ہے کہ رقعہ کسی پیکارڈ موٹر میں جا گرے ..... اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اڑتا اڑتا سڑک

کوٹنے والے انجن کے ڈرائیور کے پاس جا پہنچے .... ہو سکنے کا یہ سلسلہ کتنا دراز تھا' اور کتنا دلچسپ!

میں نے اس کا ذکر اشوک اور ساوک سے کیا۔ اُن کو مزا آ گیا۔ اور مزا لینے کی خاطر ہم نے برانڈی کا ایک اور دور چلایا۔ اور بے لگام خیال آرائیاں شروع کر دیں۔ جب محفل برخاست ہوئی، تو طے پایا کہ کہانی کی بنیادیں اسی خیال پر استوار کی جائیں۔

کہانی تیار ہو گئی۔ مگر اس کی شکل کچھ اور ہی تھی۔ حسینہ کا لکھا ہوا رقعہ رہا' نہ سڑکیں کوٹنے والا انجن۔ پہلے پہلے خیال تھا، کہ ٹریجڈی ہونی چاہیئے۔ مگر اشوک چاہتا تھا کہ کامیڈی ہو۔ اور وہ بھی بہت ہی تیز رفتار۔ چنانچہ دماغ کی ساری قوتیں اسی طرف صرف ہونے لگیں۔ کہانی مکمل ہو گئی۔ تو اشوک کو پسند آئی۔ شوٹنگ شروع ہو گئی۔ اب فلم کا ایک ایک فریم اشوک کی ہدایات کے ماتحت تیار ہونے لگا۔ بہت کم لوگ جانتے ہیں کہ "آٹھ دن" تمام و کمال اشوک کی ڈائرکشن کا نتیجہ تھی۔ کہ پردے پر ڈائرکٹر کا نام ڈی این، پائی تھا۔ جس نے اس فلم کا ایک انچ بھی ڈائرکٹ نہیں کیا تھا۔ بمبئی ٹاکیز میں فلم ڈائرکٹر کو بہت کم اہمیت دی جاتی تھی۔ سب مل کر کام کرتے تھے۔ جب فلم نمائش کے لئے پیش ہوتا تھا تو ایک کارکن کا نام بطور ڈائرکٹر کے پیش کر دیا جاتا تھا۔ یہ طریقہ کار فلستان میں بھی رائج تھا۔ ڈی' این پائی فلم ایڈیٹر تھا۔ اور اپنے کام میں بہت ہوشیار۔ چنانچہ متفقہ طور پر یہی فیصلہ ہوا تھا کہ بہ حیثیت ڈائرکٹر کے اس کا نام فلم کے کریڈٹ ٹائٹلز میں پیش کیا جائے۔

اشوک جتنا اچھا کردار کا ہے۔ اتنا ہی اچھا ہدایت کار بھی ہے۔ اس کا علم مجھے "آٹھ دن" کی شوٹنگ کے دوران میں ہوا۔ معمولی سی معمولی منظر پر بھی وہ بہت

محنت کرتا تھا۔ شوٹنگ سے ایک روز پہلے وہ مجھ سے نظر ثانی کیا ہوا سین لیتا۔ اور غسل خانے میں بیٹھ کر گھنٹوں اس کی نوک پلک پر غور کرتا رہتا ....
یہ عجیب بات ہے کہ باتھ روم کے علاوہ اور کسی جگہ وہ پوری توجہ سے فکر طلب امور پر غور نہیں کر سکتا۔

اس فلم میں چار نئے آدمی بطور ایکٹر پیش ہوئے۔ راجہ مہدی علی خاں، اوپندر ناتھ اشک، محسن عبداللہ (پُراسرار نینا کے سابق شوہر) اور راقم الحروف ——— طے یہ ہوا تھا کہ ایس مکرجی کو ایک رول دیا جائے گا۔ مگر وقت آنے پر وہ اپنی بات سے پھر گئے۔ اس لئے کہ ان کے فلم "چل چل رے نوجوان" میں کیمرے کی دہشت کے باعث میں نے کام کرنے سے انکار کر دیا تھا۔ مکرجی کو بہانہ ہاتھ آیا۔ اصل میں وہ خود کیمرے سے خوفزدہ تھے۔

ان کا رول ایک "شل شوکڈ فوجی" کا تھا۔ اس کے لئے لباس وغیرہ سب تیار تھے۔ جب مکرجی نے انکار کیا تو اشوک بہت سٹ پٹایا، کہ ان کی جگہ اور کسے منتخب کرے۔

کئی دن شوٹنگ بند رہی۔ رائے بہادر چونی لال جب لال پیلے ہونے لگے، تو اشوک میرے پاس آیا۔ میں چند مناظر کو دوبارہ لکھ رہا تھا۔ اس نے میز پر سے میرے کاغذ اٹھا کر ایک طرف رکھے اور کہا۔

"چلو منٹو"

میں اس کے ساتھ چل پڑا۔ میرا خیال تھا کہ وہ مجھے نئے گیت کی دھن سنوانے لے جا رہا ہے۔ مگر وہ مجھے سیدھا پہلے گیا۔ اور کہنے لگا۔ "پاگل کا پارٹ تم کرو گے"

مجھے معلوم تھا کہ مکرجی انکار کر چکا ہے۔ اور اشوک کو اس خاص رول کے

لئے کوئی آدمی نہیں مل رہا۔ لیکن یہ معلوم نہیں تھا کہ وہ مجھ سے کہے گا کہ میں یہ رول ادا کردوں۔ چنانچہ میں نے اس سے کہا۔" پاگل ہوئے ہو" اشوک سنجیدہ ہوگیا۔ اور کہنے لگا کہ نہیں منٹو۔ تمہیں یہ رول لینا ہی پڑے گا۔ راجہ مہدی علی خاں اور اوپندر ناتھ اشک نے بھی اصرار کیا۔ راجہ نے کہا "تم نے مجھ کو اشوک کا بہنوئی بنا دیا۔ حالانکہ میں شریف آدمی ہرگز اس کے لئے تیار نہ تھا، کیونکہ میں اشوک کی عزت کرتا ہوں۔ تم پاگل بن جاؤ گے تو کون سی آفت آجائے گی"

اسی پر مذاق شروع ہوگیا۔ اور مذاق مذاق میں سعادت حسن منٹو، پاگل فلائیٹ لفٹنٹ کرپارام بن گیا.... کیمرے کے سامنے میری جو حالت ہوئی اس کو اللہ بہتر جانتا ہے۔

فلم تیار ہو کر نمائش کے لئے پیش ہوا تو کامیاب ثابت ہوا۔ ناقدین نے اسے بہترین کامیڈی قرار دیا.... میں اور اشوک خاص طور پر بہت ہی مسرور تھے۔ اور ہمارا ارادہ تھا، کہ اب کی کوئی بالکل نئے ٹائپ کا فلم بنائیں گے، مگر قدرت کو یہ منظور نہیں تھا۔

ساوک واچا "آٹھ دن" کی شوٹنگ کے آغاز ہی میں اپنی والدہ کے علاج کے سلسلہ میں لندن چلا گیا تھا۔ وہ جب واپس آیا، تو فلمی صنعت میں ایک انقلاب برپا ہو چکا تھا۔ کئی اداروں کے دیوالے پٹ گئے تھے۔ بمبئی ٹاکیز کی نہایت ابتر حالت تھی۔ ہمانسو رائے آنجہانی کے بعد دیویکا رانی چند برسوں کی عدت کے بعد روس کے ایک جلا وطن نواب کے آرٹسٹ لڑکے روورک سے رشتۂ ازدواج قائم کرکے فلمی دنیا تیاگ چکی تھی۔ دیویکا رانی کے بعد بمبئی ٹاکیز پر کئی بیرونی حملہ آوروں نے قبضہ کیا۔ مگر اس کی حالت نہ سدھار سکے۔ آخر ساوک واچا لندن سے واپس آئے۔ اور جراتِ رندانہ سے کام لے کر بمبئی ٹاکیز کی عنانِ حکومت

اشوک کی مدد سے اپنے ہاتھ میں لے لی۔

اشوک کو فلستان چھوڑنا پڑا۔ اس دوران میں لاہور سے مسٹر موتی بی گڈوانی نے تار کے ذریعے سے ایک ہزار روپیہ ماہوار کی آفر دی۔ میں چلا گیا ہوتا، مگر مجھے ساوک کا انتظار تھا۔ جب اشوک اور وہ دونوں بمبئی ٹاکیز میں اکٹھے ہوئے تو میں ان کے ساتھ تھا۔ یہ وہ زمانہ تھا کہ ہندوستان کی تقسیم کے لئے انگریز رف کاپیوں پر نقشے بنا رہا تھا۔ بھس میں چنگی ڈال یہ بی جمالو الگ کھڑی ہو کر تماشا دیکھنے کے لئے جگہ بنا رہی تھی۔

میں نے جب بمبئی ٹاکیز میں قدم رکھا۔ تو ہندو مسلم فسادات شروع تھے۔ جس طرح کرکٹ کے میچوں میں وکٹیں اڑتی ہیں، باؤنڈریاں لگتی ہیں، اس طرح ان فسادوں میں لوگوں کے سر اڑتے تھے اور بڑی بڑی آگیں لگتی تھیں۔

ساوک واچا نے بمبئی ٹاکیز کی ابتر حالت کا اچھی طرح جائزہ لینے کے بعد جب انتظام سنبھالا، تو اسے بہت سی مشکلیں درپیش آئیں۔ غیر ضروری عنصر کو، جو مذہب کے لحاظ سے ہندو تھا، نکال باہر کیا، تو کافی گڑبڑ ہوئی۔ مگر جب اس کی جگہ پُر کی گئی تو مجھے محسوس ہوا کہ کلیدی آسامیاں سب مسلمانوں کے پاس ہیں۔ میں تھا، شاہد لطیف تھا، عصمت چغتائی تھی، کمال امروہوی تھا، حسرت لکھنوی تھا، نذیر اجمیری، ناظم پانی پتی اور میوزک ڈائریکٹر غلام حیدر تھے۔ یہ سب جمع ہوئے تو ہندو کارکنوں میں ساوک واچا اور اشوک کے خلاف نفرت کے جذبات پیدا ہو گئے۔ میں نے اشوک سے اس کا ذکر کیا، تو ہنسنے لگا۔ "میں واچا سے کہہ دوں گا کہ وہ ایک ڈانٹ پلا دے۔"

ڈانٹ بتائی گئی تو اس کا اثر الٹا ہوا۔ واچا کو گمنام خط موصول ہونے لگے کہ اگر اس نے اپنے اسٹوڈیو سے مسلمانوں کو باہر نہ نکالا۔ تو اس کو آگ لگا دی

جائے گی۔ یہ خط واچا پڑھتا تو آگ بگولہ ہو جاتا" سالے مجھ سے کہتے ہیں کہ میں غلطی پہ ہوں.... میں غلطی پہ ہوں.... میں غلطی پہ ہوں تو ان کے باوا کا کیا جاتا ہے.... آگ لگائیں تو میں اُن سب کو اس میں جھونک دوں گا۔"

اشوک کا دل و دماغ فرقہ وارانہ تعصب سے بالکل پاک ہے۔ وہ کبھی ان خطوط پہ سوچ ہی نہیں سکتا تھا۔ جن پہ آگ لگانے کی دھمکیاں دینے والے سوچ رہے تھے۔ وہ مجھ سے ہمیشہ کہتا "منٹو یہ سب دیوانگی ہے..... آہستہ آہستہ دور ہو جائے گی۔"

مگر آہستہ آہستہ دور ہونے کی بجائے یہ دیوانگی بڑھتی ہی چلی جا رہی تھی۔ .... اور میں خود کو مجرم محسوس کر رہا تھا، اس لئے کہ اشوک اور واچا میرے دوست تھے۔ وہ مجھ سے مشورے لیتے تھے۔ اس لئے کہ ان کو میرے خلوص پہ بھروسہ تھا۔ لیکن میرا یہ خلوص میرے اندر سکڑ رہا تھا..... میں سوچتا تھا اگر بمبئی ٹاکیز کو کچھ ہو گیا، تو میں اشوک اور واچا کو کیا منہ دکھاؤں گا۔

فسادات زوروں پر تھے۔ ایک دن میں اور اشوک بمبئی ٹاکیز سے واپس آ رہے تھے۔ راستے میں اس کے گھر دیر تک بیٹھے رہے۔ شام کو اس نے کہا۔ چلو میں تمہیں چھوڑ آؤں.... شورٹ کٹ کی خاطر وہ موٹر کو ایک خالص اسلامی محلے میں لے گیا..... سامنے سے ایک برات آ رہی تھی۔ جب میں نے بینڈ کی آواز سُنی تو میرے اوسان خطا ہو گئے۔ ایک دم اشوک کا ہاتھ پکڑ کر میں چلایا۔ "دادامنی! یہ تم کدھر آ نکلے؟"

اشوک میرا مطلب سمجھ گیا۔ مسکرا کر اس نے کہا۔ "کوئی فکر نہ کرو۔" میں کیونکر فکر نہ کرتا۔ موٹر ایسے اسلامی محلے میں تھی۔ جہاں کسی ہندو کا گذر ہی نہیں ہو سکتا تھا۔ اور اشوک کو کون نہیں پہچانتا تھا۔ کون نہیں جانتا تھا کہ وہ ہندو

ہے .... ایک بہت بڑا ہندو جس کا قتل معرکہ خیز تھا .... مجھے عربی زبان میں کوئی دعا یاد نہیں تھی۔ قرآن کی کوئی موزوں و مناسب آیت بھی نہیں آتی تھی۔ دل ہی دل میں اپنے اوپر لعنتیں بھیج رہا تھا۔ اور دھڑکتے ہوئے دل سے اپنی زبان میں بے جوڑ سی دعا مانگ رہا تھا۔ کہ اے خدا مجھے سرخرو رکھ۔ .... ایسا نہ ہو کوئی مسلمان اشوک کو مار دے اور میں ساری عمر اس کا خون اپنی گردن پر محسوس کرتا رہوں۔ یہ گردن قوم کی نہیں میری اپنی گردن تھی۔ مگر یہ ایسی ذلیل حرکت کے لئے دوسری قوم کے سامنے ندامت کی وجہ سے جھکنا نہیں چاہتی تھی۔

جب موٹر برات کے جلوس کے پاس پہنچی، تو لوگوں نے چلّانا شروع کر دیا۔ "اشوک کمار ــــ اشوک کمار" میں بالکل یخ ہو گیا۔ اشوک اسٹیرنگ پر ہاتھ رکھے خاموش تھا۔ میں خوف و ہراس کی یخ بستگی سے نکل کر ہجوم سے یہ کہنے والا تھا، کہ دیکھو، ہوش کرو۔ میں مسلمان ہوں۔ یہ مجھے میرے گھر چھوڑنے جا رہا ہے .... کہ دو نوجوانوں نے آگے بڑھ کر بڑے آرام سے کہا۔ "اشوک بھائی، آگل راستہ نہیں ملے گا۔ ادھر باجو کی گلی سے چلے جاؤ۔"

اشوک بھائی؟ اشوک ان کا بھائی تھا اور میں کون تھا؟ میں نے دفعتاً اپنے لباس کی طرف دیکھا جو کھادی کا تھا .... معلوم نہیں انہوں نے مجھے کیا سمجھا ہوگا۔ مگر ہو سکتا ہے کہ انہوں نے اشوک کی موجودگی میں مجھے دیکھا ہی نہ ہو۔

موٹر جب اس اسلامی محلے سے نکلی تو میری جان میں جان آئی۔ میں نے اللہ کا شکر ادا کیا تو اشوک ہنسا۔ "تم خواہ مخواہ گھبرا گئے ــــ آرسٹوٹل کو یہ لوگ کچھ نہیں کہا کرتے۔"

چند روز بعد بمبئی ٹاکیز میں نذیر اجمیری کی کہانی (جو "مجبور" کے نام سے فلم بند ہوئی) پر میں نے جب کڑی نکتہ چینی کی۔ اور اس میں کچھ تبدیلیاں کرنا چاہیں تو نذیر اجمیری

نے اشوک اور واچا سے کہا۔ "منٹو کو آپ ایسے مباحثوں کے دوران میں نہ بٹھایا کریں وہ چونکہ خود افسانہ نویس ہے اس لئے متعصّب ہے۔"

میں نے بہت غور کیا، کچھ سمجھ میں نہ آیا۔ آخر میں نے اپنے آپ سے کہا۔ "منٹو بھائی ——— آگے راستہ نہیں ملے گا ——— کار موٹر روک لو ——— ادھر باجو کی گلی سے چلے جاؤ۔"

اور میں چپ چاپ باجو کی گلی سے پاکستان چلا آیا۔ جہاں میرے افسانے "ٹھنڈا گوشت" پر مقدمہ چلایا گیا۔

# کے کے

یہ اس مشہور ایکسٹرا بیس کا نام ہے جو ہندوستان کے متعدد فلموں میں آچکی ہے۔ اور آپ نے یقیناً اسے پردے پر کئی مرتبہ دیکھا ہوگا ـــــ میں جب بھی اس کا نام کسی فلم کے اشتہار میں دیکھتا ہوں، تو میرے تصوّر میں اس کی پوری شکل بعد میں، لیکن سب سے پہلے اس کی ناک اُبھرتی ہے ـــــ تیکھی ـــــ بہت تیکھی ناک۔ اور پھر مجھے بمبے ٹاکیز کا وہ دلچسپ واقعہ یاد آجاتا ہے، جو میں ابھی بیان کرنے والا ہوں۔

بٹوارے پر جب پنجاب میں فسادات شروع ہوئے تو کلدیپ کور جو کہ لاہور میں تھی اور وہاں فلموں میں کام کر رہی تھی۔ ہجرت کر کے بمبئی چلی آئی۔ اس کے ساتھ اس کا دوست پران بھی تھا۔ جو پنجولی کے کئی فلموں میں کام کر کے شہرت حاصل کر چکا تھا۔

اب پران کا ذکر آیا ہے، تو اس کے متعلق بھی چند تعارفی سطور لکھنے میں کوئی مضائقہ نہیں ہے۔

پران اچھا خاصا خوش شکل مرد ہے۔ لاہور میں اس کی شہرت اس وجہ سے بھی تھی کہ وہ بڑا خوش پوش تھا۔ بہت ٹھاٹ سے رہتا تھا، اس کا ٹانگہ گھوڑا لاہور کے ریئسی ٹانگوں میں سب سے زیادہ خوبصورت اور دلکش تھا۔

مجھے معلوم نہیں پران سے کلدیپ کور کی دوستی کیسے اور کیونکر ہوئی۔ اس لئے کہ میں لاہور میں نہیں تھا۔ لیکن فلمی دنیا میں دوستیاں عجائب میں داخل نہیں۔ وہاں ایک فلم کی

شوٹنگ کے دوران میں ایکٹریسوں کا دوستانہ بیک وقت کئی مردوں سے ہو سکتا ہے جو اس فلم سے وابستہ ہوں۔

جن دنوں پران اور کلدیپ کی خوب چھن رہی تھی، ان دنوں شیام مرحوم بھی وہیں تھا۔ پونا اور بمبئی میں قسمت آزمائی کرنے کے بعد وہ لاہور چلا گیا تھا۔ جس سے اسے والہانہ محبت تھی۔ عشق پیشہ انسان تھا۔ دونوں کا تصادم ہوا۔ قریب تھا، کہ وہ ایک دوسرے میں مدغم ہو جاتے، کہ ایک اور لڑکی شیام کی زندگی میں داخل ہو گئی، اس کا نام ممتاز تھا (جو تاجی کے نام سے مشہور ہے) یہ زیب قریشی ایم اے کی چھوٹی بہن تھی۔

کلدیپ کو شیام کی یہ قلابازی پسند نہ آئی، چنانچہ وہ اس سے ناراض ہو گئی۔ اور ہمیشہ ناراض رہی۔ میں یہاں آپ کو یہ بتا دوں، کہ کلدیپ بڑی ہٹیلی عورت ہے جو بات اس کے دماغ میں سما جائے اس پر اڑی رہتی ہے۔

میں آپ کو ایک دلچسپ بات سناؤں۔ یہ واقعہ بمبئی کا ہے۔ ہم تینوں بمبئی ٹاکیز میں تھے۔ اور شام کو برقی ٹرین سے اپنے اپنے گھر جا رہے تھے۔ فرسٹ کلاس کا ڈبہ اس دن قریب قریب خالی تھا۔ یعنی ہم تینوں کے سوا اس میں اور کوئی مسافر نہ تھا۔

شیام طبعاً بڑا بلند بانگ اور منہ پھٹ تھا۔ جب اس نے دیکھا کہ کمپارٹمنٹ میں اور کوئی غیر نہیں تو اس نے کلدیپ کو رسے چھیڑ خانی شروع کر دی۔ لیکن میں سمجھتا ہوں اس کا اصل مقصد یہ تھا کہ وہ رشتہ جو لاہور میں قائم ہوتے ہوتے رہ گیا تھا، اب بمبئی میں قائم ہو جائے۔ کیونکہ تاجی سے اس کی کھٹ پٹ ہو گئی تھی۔ وہ ان دنوں بقول اس کے "خالی ہاتھ" تھا۔

چنانچہ اس نے کلدیپ کو رسے کہا "کے کے ــــ تم مجھ سے دور دور کیوں رہتی ہو ــــ ادھر آؤ ــــ میرے پاس بیٹھو"!

کلدیپ کور کی ناک اور زیادہ تیکھی ہو گئی ۔۔۔ "شیام صاحب، آپ مجھ پر ڈورے نہ ڈالیں۔"

میں اُن کی گفتگو جو مجھے مکمل طور پر یاد ہے، یہاں نقل کرنا نہیں چاہتا، اس لئے کہ وہ بہت بے باک تھی۔ ویسے اس کی روح اپنے لفظوں میں بیان کئے دیتا ہوں۔

شیام کبھی سنجیدگی سے بات نہیں کرتا تھا۔ اس کے ہر لفظ میں ایک قہقہہ ہوتا تھا۔ اس نے کلدیپ سے اسی مخصوص انداز میں کہا: "اس پران کو چھوڑو اور میرے ساتھ ناتا جوڑو ۔۔۔ وہ میرا دوست ہے لیکن یہ معاملہ بڑی آسانی کے ساتھ طے ہو سکتا ہے۔"

کلدیپ کور کی آنکھیں اس کی ناک ہی کی طرح بڑی اور تیکھی ہیں۔ اس کا لب دہان بھی بڑا تیکھا ہے۔ اس کے چہرے کا ہر خد و خال تیکھا ہے۔ جب وہ اپنی بڑی بڑی آنکھیں جھپکا کر بات کرتی ہے تو آدمی بوکھلا جاتا ہے کہ یہ کیا مصیبت ہے ۔۔۔ اس نے تیز تیز نگاہوں سے شیام کی طرف دیکھا۔ اور اس سے زیادہ تیز لہجے میں اس سے کہا۔ "منہ دھو کر رکھئے شیام صاحب!"

شیام پر عورتوں کی تیز گفتاری کا بھلا کیا اثر ہوتا۔ اس نے ایک قہقہہ لگایا، اور کہا: "کے کے ۔۔۔ تم لاہور میں مجھ پر مرتی تھیں، یاد نہیں تمہیں؟"

اب کلدیپ کور نے قہقہہ لگایا۔ جس میں نسوانی طنز بھرا تھا۔ "آپ کو وہم ہو گیا تھا ۔۔۔"

شیام نے کہا: "غلط ہے۔ تم مجھ پر یقینی طور پر مرتی تھیں۔"

میں نے کلدیپ کی طرف دیکھا، مجھے محسوس ہوا کہ اس کا ہٹیلا دماغ اسکی سپردگی کی خواہش کو رد کرنے کی کوشش میں مصروف ہے۔ چنانچہ اس نے اپنی تیکھی پلکیں پھڑپھڑا کے کہا۔ "مرتی تھی، لیکن اب نہیں مروں گی۔"

شیام نے اسی لاابالیانہ انداز میں کہا۔ "اب نہیں مرو گی تو کل مرو گی۔ مرنا بہرحال

تمہیں مجھی پہ ہے"

کلدیپ کور بھنا گئی "شیام تم مجھ سے آج آخری بار سن لو۔ کہ تمہارا میرا کوئی سلسلہ نہیں ہو سکتا —— تم اتراتے ہو۔ ہو سکتا ہے لاہور میں کبھی میری طبیعت تم پہ آئی ہو لیکن جب تم نے بے رُخی برتی تو میں تمہیں کیوں منہ لگاؤں —— اب اس قصّے کو ختم کرو"

قصہ ختم ہو گیا، صرف وقتی طور پر۔ کیونکہ شیام زیادہ بحثا بحثی کا عادی نہیں تھا۔

جب بٹوارہ ہوا تو کلدیپ کور اور پران کو افراتفری میں لاہور چھوڑنا پڑا —— پران کی موٹر جو غالباً کلدیپ کور کی ملکیت تھی۔ یہیں رہ گئی۔ لیکن کلدیپ کور بڑی باہمت عورت ہے۔ اس کے علاوہ اسے یہ بھی معلوم ہے کہ وہ مردوں کو اپنی انگلیوں پر نچا سکتی ہے اس لئے کہ وہ کچھ دیر کے بعد لاہور آئی۔ اور فسادات کے دوران میں یہ موٹر خود چلا کر بمبئی لے گئی۔

جب میں نے موٹر دیکھی اور پران سے پوچھا کہ یہ کب خریدی گئی ہے۔ تو اس نے مجھے سارا واقعہ سُنایا کہ کے لاہور سے لے کر آئی ہے۔ اور یہ کہ راستے میں اسے کوئی تکلیف نہیں ہوئی۔ ایک صرف دلّی میں اسے چندروز ٹھہرنا پڑا۔ کہ ایک گڑبڑ ہو گئی تھی۔ یہ گڑبڑ کیا تھی، اس کے متعلق مجھے کچھ معلوم نہیں۔

جب وہ موٹر لے کر آئی تو اس نے سکھوں پہ مسلمانوں کے مظالم بیان کئے۔ اور اس انداز سے بیان کئے کہ معلوم ہوتا تھا وہ میز پہ سے مکھن لگانے والی چھری اُٹھائے گی، اور میرے پیٹ میں بھونک دے گی۔ لیکن مجھے بعد میں محسوس ہوا کہ وہ جذباتی ہو گئی تھی۔ ورنہ مسلمانوں سے کوئی عداوت یا بغض نہیں؛

اصل میں اس کا کوئی مذہب نہیں۔ وہ صرف عورت ہے۔ ایک ایسی عورت جو جسمانی لحاظ سے بڑی پُرخلوص ہے۔ اس کی ناک بے حد تیکھی ہے۔ اس کی آنکھیں بہت تیز ہیں۔ اس کا لب دہان بہت باریک ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس کے چہرے پہ ذرا سا چڑھاؤ

بہت تیز و تند بن جاتا ہے۔ اس کے علاوہ اس کا لہجہ اور اس کی آواز بھی غیر معمولی طور پر تیز و طرّار ہے ـــــ کلدیپ کور کی تیکھی ناک کا ذکر میں کئی بار کر چکا ہوں۔ اس سلسلے میں آپ ایک لطیفہ سُن لیجئے۔

میں فلستان چھوڑ کر اپنے دوست اشوک کمار اور ساوک واچا کے ساتھ بمبئی ٹاکیز چلا گیا تھا۔ اس زمانے میں فسادات کا آغاز تھا۔ اسی دوران میں کلدیپ کور اور اس کا دوست پران ملازمت کے لئے وہاں آئے۔

پران سے جب میری ملاقات شیام کے توسط سے ہوئی تو میری اس کی فوراً دوستی ہو گئی۔ بڑا بے ریا آدمی ہے۔ کلدیپ کور سے البتہ کچھ رسمی قسم کی ملاقات رہی۔

ان دنوں دو تین فلم ہمارے اسٹوڈیو میں شروع ہونے والے تھے۔ چنانچہ جب کلدیپ کور نے مسٹر ساوک واچا سے ملاقات کی تو انہوں نے جوزف ورشنگ جرمن کیمرہ مین سے کہا کہ وہ اس کا کیمرہ ٹیسٹ لے تاکہ اطمینان ہو جائے۔

ورشنگ گورے رنگ اور ادھیڑ عمر کا موٹا سا آدمی ہے۔ اس کو ہمانسو رائے مرحوم اپنے ساتھ جرمنی سے لائے تھے۔ جب جنگ شروع ہوئی، تو اس کو دیولالی میں نظر بند کر دیا گیا۔ ایک عرصے تک وہاں رہا۔ پھر جب جنگ ختم ہوئی تو اسے رہا کر دیا گیا۔ اور وہ پھر واپس بمبئی ٹاکیز میں آ گیا۔ اس لئے کہ مسٹر واچا سے اس کے دوستانہ تعلقات تھے۔ کیونکہ وہ عرصہ ہوا بمبئی ٹاکیز میں اکٹھے ایک دوسرے کے ساتھ کام کرتے رہے تھے۔ ان دنوں مسٹر واچا ساؤنڈ ریکارڈسٹ تھے۔

ورشنگ نے اسٹوڈیو میں روشنی کا انتظام کر لیا۔ اور میک اپ مین سے کہا کہ وہ کلدیپ کور کو تیار کر کے کیمرہ ٹیسٹ کے لئے لائے۔ وہ خود تیار تھا، کیمرہ تیار تھا۔ اس کو اس نے اچھی طرح دیکھا۔ روشنیاں درست کرائیں اور اپنا چُرٹ سُلگا کے ایک طرف کھڑا ہو گیا۔

کلدیپ کور آئی، میں نے اسے دیکھا، اس کی ناک پر میک اَپ مین نے سُرخی اور سفیدے کے کچھ ایسے خط لگائے کہ وہ دس گنا اور تیکھی ہو گئی تھی۔ جب ورشنگ نے اس کو دیکھا تو وہ گھبرا گیا کیونکہ وہ سراپا ناک تھی۔

کلدیپ کور بالکل بے خوف، بے جھجک کیمرے کے سامنے کھڑی ہو گئی۔ ورشنگ نے اس کو اب کیمرے کی آنکھ سے دیکھا، مگر میں محسوس کر رہا تھا، کہ اس کو بڑی الجھن ہو رہی ہے۔ وہ اس کی ناک ایک ایسے زاویے پر بٹھانے کی کوشش کر رہا تھا، کہ معیوب معلوم نہ ہو۔

بے چارہ اس کوشش میں پسینہ پسینہ ہو گیا۔ آخر اس نے تھک ہار کے مجھ سے کہا۔ میں اب ایک کپ چائے پیوں گا۔ میں سارا معاملہ سمجھ گیا تھا چنانچہ ہم دونوں کینٹین میں چلے گئے۔ وہاں اس نے پسینہ پونچھتے ہوئے مجھ سے کہا "مسٹر منٹو ـــــ اس کی ناک بھی ایک آفت ہے۔ کیمرے میں گھسی چلی آتی ہے۔ چہرہ بعد میں آتا ہے ناک پہلے آتی ہے۔ ـــــ میں کیا کروں، کچھ سمجھ میں نہیں آتا"

میری سمجھ میں خود کچھ نہیں آتا تھا۔ میں نے کہا۔ تم جانو تمہارا کام جانے ـــــ پھر اس نے ایک اور الجھن کا اظہار کیا۔ لیکن وہ میرے کان میں۔ "مسٹر منٹو ـــــ اس کا وہ معاملہ ٹھیک نہیں ہے۔ لیکن میں اس سے کیسے کہوں"

اور یہ کہہ کر موٹے ورشنگ نے اپنے ماتھے کا پسینہ پھر پونچھا ـــــ میں اس کا مطلب سمجھ گیا۔ لیکن ورشنگ نے پھر بھی مجھے وضاحت سے سب کچھ بتا دیا اور مجھ سے درخواست کی کہ میں کسے کہوں وہ اس معاملہ کو ٹھیک کرے۔ کہ وہ بہت ضروری ہے۔ ناک کا وہ کوئی نہ کوئی زاویہ نکال لے گا۔ مگر اس معاملے کے متعلق وہ کچھ بھی نہیں کر سکتا، کہ یہ اس کا کام ہے۔ میں نے اس کی تشفی کی، کہ میں سب ٹھیک کر دوں گا۔ کیونکہ اس نے مجھے اس 'معاملے' کی درستی کا حل بتا دیا تھا، جو ۳۵ روپے میں وائٹ وے اینڈ

لیڈ لا کی دوکان سے دستیاب ہو سکتا تھا ـــــ اس روز میٹ کسی بہانے موقوف کر دیا گیا۔ کلدیپ جب اسٹوڈیو سے باہر نکلی، تو میں نے بے تکلفی سے ساری بات جو اس 'معاملے' کے متعلق تھی بتا دی۔ اور اس سے کہا کہ وہ آج ہی فورٹ میں جا کر وہ چیز خریدے، جس سے اس کے جسم کا نقص دور ہو جائے گا۔ اس نے بلا جھجک میری بات سُنی۔

جب دوسرے روز اسٹوڈیو میں اس سے ملاقات ہوئی تو زمین آسمان کا فرق تھا۔ یہ چیزیں ایجاد کرنے والے بھی بلا کے آدمی ہیں، جو یوں چٹکیوں میں "معاملوں" کو کہاں سے کہاں پہنچا دیتے ہیں۔ ورشنگ نے جب اسے دیکھا تو وہ مطمئن تھا۔ کہ کلدیپ کی ناک اسے تنگ کر رہی تھی۔ مگر اب دوسرا معاملہ بالکل ٹھیک تھا۔ چنانچہ اس نے ٹیسٹ لیا۔ اور جب اس کا پرنٹ تیار ہوا اور ہم سب نے اسے پروجیکشن ہال میں دیکھا، تو اس کی شکل و صورت کو پسند کیا۔ اور یہ رائے متفقہ طور پر قائم ہوئی، کہ وہ خاص رولز کے لئے بہت اچھی رہے گی۔ اور خصوصاً ویمپ کے رول کے لئے۔

کلدیپ سے مجھے زیادہ ملنے جلنے کا اتفاق نہیں ہوا۔ پران چونکہ دوست تھا، اور اس کے ساتھ اکثر شامیں گذرتی تھیں، اس لئے کلدیپ بھی کبھی کبھی ہمارے ساتھ شریک ہو جاتی تھی۔ وہ ایک ہوٹل میں رہتی تھی، جو ساحلِ سمندر کے پاس تھا۔ پران بھی اس سے کچھ دور ایک ہوٹل میں مقیم تھا۔ جہاں اس کی بیوی اور بچہ ہی تھا۔ لیکن اس کا زیادہ وقت کلدیپ کے ساتھ ہی گذرتا تھا۔

میں اب آپ کو ایک دلچسپ واقعہ سُناتا ہوں۔ میں اور شیام تاج محل ہوٹل میں بیئر پینے جا رہے تھے کہ راستے میں مشہور نغمہ نویس مدہوک سے ملاقات ہو گئی۔ وہ ہمیں ایروس سینما کی بار میں لے گئے۔ وہاں ہم بہت دیر تک بیئر نوشی میں مشغول رہے مدہوک ٹیکسیوں کا بادشاہ مشہور ہے۔ باہر ایک گرانڈیل ٹیکسی کھڑی تھی۔ یہ مدہوک صاحب کے پاس تین دن سے تھی۔ جب ہم فارغ ہوئے تو انہوں نے پوچھا کہ ہمیں کہاں

جانا ہے۔ مدہوک صاحب کو نگار سلطانہ کے پاس جانا تھا۔ پہلے کسی زمانے میں شیام کے بھی مراسم تھے۔ اور کُلدیپ کور بھی اُس کے آس پاس رہتی تھی۔ شیام نے مجھ سے کہا چلو پران سے ملتے ہیں۔ چنانچہ مدہوک صاحب کی ٹیکسی میں بیٹھ کر ہم وہاں پہنچے۔ وہ تو نگار سلطانہ کے پاس چلے گئے۔ اور ہم دونوں کلدیپ کور کے یہاں۔

پران وہاں بیٹھا تھا۔ ایک مختصر سا کمرہ تھا۔ بیرُپی ہوئی تھی۔ غنودگی طاری تھی۔ اس کو زائل کرنے کے لئے شیام نے سوچا کہ تاش کھیلنی چاہیئے۔ کلدیپ فوراً تیار ہوگئی۔ لیکن یہ کہا کہ فلیش ہوگی۔ ہم مان گئے۔ فلیش شروع ہوگئی۔ کلدیپ اور پران ایک ساتھ تھے۔ پران ہی پتے بانٹتا تھا۔ اور وہی اُٹھاتا تھا۔ اور کلدیپ اس کے کاندھے کے ساتھ اپنی نوکیلی ٹھوڑی ٹِکائے بیٹھی تھی۔ البتہ جتنے روپے پران جیتتا تھا اٹھا کر اپنے پاس رکھ لیتی تھی۔ اس کھیل میں ہم صرف ہارا کئے۔ میں نے فلیش کئی مرتبہ کھیلی ہے۔ لیکن وہ فلیش کچھ عجیب و غریب قسم کی تھی۔ میرے پچھتر روپے پندرہ منٹ کے اندر اندر کلدیپ کور کے پاس تھے۔ میری سمجھ میں نہ آتا تھا کہ آج پتوں کو کیا ہوگیا ہے۔ کہ ٹھکانے کے آتے ہی نہیں۔

شیام نے جب یہ رنگ دیکھا، تو مجھ سے کہا۔ "منٹو اب بند کرو۔" میں نے کھیلنا بند کر دیا۔ پران مسکرایا، اور اس نے کلدیپ سے کہا۔ "کے کے، پیسے واپس کر دو منٹو صاحب کے۔"

میں نے کہا۔ "یہ غلط ہے۔ تم لوگوں نے جیتے ہیں۔ واپسی کا سوال ہی کہاں پیدا ہوتا ہے۔"

اس پر پران نے مجھے کہا کہ اس نے جو کچھ مجھ سے جیتا ہے اپنی چابکدستی کی بدولت جیتا ہے۔ چونکہ میں اس کا دوست ہوں، اس لئے مجھ سے دھوکا کرنا نہیں چاہتا۔ لیکن پہلے سمجھا کہ وہ اس حیلے سے میرے روپے واپس کرنا چاہتا ہے۔ لیکن جب اس نے تاش کی گڈی اُٹھا کر تین چار بار پتے تقسیم کئے اور ہر بار بڑے اور جیتنے والے پتے اپنے پاس

گرائے تو میں اس کے ہتھکنڈے کا قائل ہو گیا۔ یہ کام واقعی اس کی چابکدستی کا ہے۔

پران نے پھر کلدیپ کو رسے کہا، کہ وہ روپے واپس کر دے۔ مگر اس نے انکار کر دیا۔ شیام کباب ہو گیا۔ پران ناراض ہو کر چلا گیا، غالباً اسے اپنی بیوی کے ساتھ کہیں جانا تھا۔

شیام اور میں وہیں بیٹھے رہے۔ تھوڑی دیر شیام اس سے گفتگو کرتا رہا۔ پھر اس نے کہا: "آؤ، چلو سیر کریں۔ کلدیپ راضی ہو گئی۔ ٹیکسی منگوائی گئی۔ اور ہم سب باری کھلا روانہ ہوئے وہاں پل کے پاس کلیئر روڈ پر میرا فلیٹ تھا۔ ہم سیدھے وہاں پہنچے۔ گھر میں ان دنوں کوئی بھی نہیں تھا۔ شیام میرے ساتھ رہتا تھا۔ ہم فلیٹ میں داخل ہوئے تو شیام نے پھر کلدیپ سے چھیڑ چھاڑ شروع کر دی۔ کلدیپ بہت جلد تنگ آنے والی عورت نہیں وہ کسی مرد سے گھبراتی نہیں۔ اس کو خود پر پورا اعتماد ہے۔ چنانچہ وہ دیر تک ہنستی کھیلتی رہی۔

ہاں — میں آپ کو یہ بتانا بھول گیا، کہ جب ہم کلیئر روڈ پر پہنچے، تو کلدیپ نے ایک اسٹور کے پاس ٹیکسی روکنے کے لئے کہا۔ کہ وہ سینٹ کی ایک شیشی خریدنا چاہتی ہے۔ شیام سخت کباب تھا، کہ وہ اس روپے سے یہ چیز خریدے گی، جو پران نے مجھ سے جیتے تھے۔ پر میں نے اس سے کہا کوئی ہرج نہیں، تم اس بات کا کوئی خیال نہ کرو۔ ہٹاؤ اس قصے کو۔

کلدیپ کے ساتھ اسٹور میں گیا۔ اس نے "یارڈلے" کا سینٹ پسند کیا۔ اس کی قیمت بائیس روپے آٹھ آنے تھی۔ کلدیپ نے خوبصورت شیشی اپنے پرس میں رکھی۔ اور مجھ سے کہا۔

"منٹو صاحب! قیمت ادا کر دیجئے۔"

میں اس سینٹ کے دام ہرگز ادا کرنا نہیں چاہتا تھا۔ مگر دوکاندار میرا واقف تھا۔ اور پھر ایک عورت نے اس انداز سے مجھ سے قیمت ادا کرنے کے لئے کہا تھا۔ کہ انکار کرنا مردانہ وقار کی تذلیل کا باعث ہوتا۔ چنانچہ میں نے جیب سے روپے نکالے۔ اور ادا کر دیئے۔

فلیٹ میں جب شیام کو پتہ چلا کہ سینٹ میں نے خرید کر دیا ہے۔ تو وہ آگ بگولہ ہوگیا۔ اس نے مجھے اور کلدیپ کور کو پیٹ بھر کے گالیاں دیں۔ لیکن بعد میں نرم ہوگیا اس کا اصل مقصد یہ تھا، کہ کلدیپ کسی نہ کسی طرح رام ہو جائے۔ میں نے بھی کوشش کی۔ اور کلدیپ کو سمجھایا کہ اب ان کے اختلافات مٹ جانے چاہئیں۔

کلدیپ مان گئی۔ میں نے شیام اور اس سے کہا کہ میں جاتا ہوں، تم دونوں آپس میں سمجھوتہ کر لو۔ مگر اس نے کہا کہ نہیں، یہ سمجھوتہ اس کے ہوٹل میں ہوگا۔ ٹیکسی نیچے کھڑی تھی۔ اور یہ دونوں اس میں چلے گئے۔ میں خوش تھا، کہ چلو یہ قضیہ طے ہوگیا۔ مگر پون گھنٹے کے بعد ہی شیام لوٹ آیا۔ سخت غصّے میں بھرا ہوا تھا۔ میں نے اس کو جب برانڈی کا گلاس پیش کیا، تو میں نے دیکھا، کہ اس کا ہاتھ زخمی ہے۔ خون بہہ رہا ہے۔ میں نے بڑی تشویش کے ساتھ دریافت کیا۔

"یہ کیا قصّہ ہے شیام؟"

وہ کباب تھا۔ لیکن برانڈی نے اس کے موڈ کو کسی قدر درست کر دیا۔ اس نے مجھے بتایا کہ جب کے کے کے ساتھ وہ اس کے ہوٹل پہنچا اور وہ ٹیکسی سے باہر نکلے، تو وہ (کلدیپ کو گالی دے کر) منکر ہوگئی۔ مجھے سخت غصّہ آیا۔ ہم دونوں ایک پتھریلی دیوار کے پاس کھڑے تھے۔ میں نے اس سے کہا۔ "سالی تم لاہور میں مجھ پر مرتی تھیں، اب یہ کیا نخرہ ہے۔ اس نے جواب میں کچھ ایسی بات کہی کہ میرے تن بدن میں آگ لگ گئی۔ میں نے تان کے گھونسا مارا۔ مگر وہ ایک طرف ہٹ گئی۔ اور میرا گھونسہ دیوار کے ساتھ جا ٹکرایا۔ وہ ہنستی قہقہے لگاتی اوپر ہوٹل میں چلی گئی۔ اور میں کھڑا اپنا زخمی ہاتھ دیکھتا رہ گیا۔ پھر اس نے اپنی پتلون کی جیب میں ہاتھ ڈالا۔ اور سینٹ کی شیشی نکالی۔ "روپے تو میں اس سے واپس نہ لے سکا۔ لیکن یہ سینٹ کی شیشی لے آیا ہوں۔"

کلدیپ کور عجیب و غریب شخصیت کی عورت ہے۔ جس طرح اس کی ناک تیکھی ہے۔

اسی طرح اس کا کردار تیکھا اور نوکیلا ہے۔

پچھلے دنوں یہ خبر آئی تھی، کہ اس پر ہندوستان میں پاکستان کی جاسوسی کا الزام لگایا گیا ہے، معلوم نہیں کہ اس میں کہاں تک صداقت ہے۔ لیکن میں وثوق سے اتنا ضرور کہہ سکتا ہوں کہ اس جیسی عورت "ماتا ہری" کبھی نہیں بن سکتی۔ جس کا ظاہر و باطن ایک نہ ہو ــــ!

# ستارہ گردش میں

لکھنے کے معاملے میں میں نے بڑے بڑے کڑے مراحل طے کئے ہیں لیکن مشہور قاصہ اور ایکٹریس ستارہ کے بارے میں اپنے تاثرات قلم بند کرنے میں مجھے بڑی ہچکچاہٹ کا سامنا کرنا پڑا ہے۔ آپ تو اسے ایک ایکٹریس کی حیثیت سے جانتے ہیں۔ جو ناچتی بھی ہے اور خوب ناچتی ہے۔ لیکن مجھے اس کے کردار کا مطالعہ کرنے کا بھی موقعہ ملا ہے جو عجیب و غریب ہے۔

میں نے اپنی زندگی میں کئی عورتوں کے کردار و اطوار کا مطالعہ کیا ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ جب ستارہ کے حالات زندگی مجھے آہستہ آہستہ معلوم ہوئے تو میں چکرا گیا۔ وہ عورت نہیں ایک طوفان ہے۔ اور وہ بھی ایسا طوفان، جو صرف ایک مرتبہ آکے نہیں ٹلتا۔ بار بار آتا ہے ستارہ یوں تو میانہ قد کی عورت ہے۔ مگر بلا کی مضبوط ہے۔ اس نے جتنی بیماریاں سہی ہیں، میرا خیال ہے اگر کسی اور عورت پر نازل ہوتیں، تو وہ کبھی جانبر نہ ہو سکتی۔ وہ طبعاً بہت حوصلہ مند ہے۔ شاید اس لئے کہ وہ کثرت کی عادی ہے۔

میں نے دیکھا ہے کہ صبح سویرے اُٹھ کر وہ کم از کم ایک گھنٹے تک ریاضت کرتی تھی۔ اور یہ ریاضت کوئی معمولی ریاضت نہیں ہوتی تھی۔ ایک گھنٹہ بھرپور ناچنا، ہڈیوں تک کو تھکا دیتا ہے۔ مگر ستارہ مجھے کبھی تھکی تھکی دکھائی نہیں دی۔ اصل میں اس میں وہ چیز ہے انگریزی میں Stamina کہتے ہیں۔ بدرجۂ اتم موجود ہے۔ وہ تھکنے والی جنس نہیں۔ دوسرے تھک ہار جائیں گے۔ مگر وہ ویسی کی ویسی رہے گی۔ جیسے اس نے کوئی مشقت نہیں کی۔ اس کو اپنے

فن سے پیار ہے ۔ اسی والہانہ قسم کا جو وہ مختلف مردوں سے کرتی رہی ہے۔

معمولی سے ڈانس کے لئے وہ اتنی محنت کرے گی جتنی کوئی رقاصہ عمر بھر نہیں کر سکتی۔ اس کی طبیعت میں اُپج ہے۔ وہ ہمیشہ کوئی خاص بات پیدا کرنا چاہے گی ۔ چلت پھرت جو ایک نٹنی میں ہو سکتی ہے ۔ اس میں ضرورت سے زیادہ موجود ہے۔ وہ ایک سیکنڈ کے لئے بھی نچلی نہیں بیٹھ سکتی ۔ اس کی بوٹی بوٹی تھرکتی رہتی ہے ۔

کہا جاتا ہے کہ وہ نیپال کی رہنے والی ہے۔ مجھے اس کے متعلق حتمی طور پر کچھ معلوم نہیں لیکن میں اتنا جانتا ہوں کہ ستارہ کے علاوہ اس کی دو بہنیں اور تھیں ، یہ ترشول یوں مکمل ہوتا ہے۔ تارہ ، ستارہ اور الکنندہ تارا اور الکنندہ تو اب قریب قریب معدوم ہو چکی ہیں، میرا خیال ہے ان کا نام بھی کسی کو یاد نہیں ہو گا۔

ان تین بہنوں کی زندگی ویسے بہت دلچسپ ہے۔ تارہ کی کئی مردوں سے وابستگی رہی ۔ اس ہجوم میں ایک شوکت ہاشمی بھی ہیں۔ جو اب تک کئی پاپڑ بیل چکے ہیں۔ حال ہی میں ان کی بیوی پورنیما نے ان سے طلاق لی ہے ۔ اور وہ اس سلسلے میں بڑے دردناک بیان دے چکے ہیں۔ الکنندہ کئی ہاتھوں سے گذری اور آخر میں پربھات کے شہرت یافتہ ایکٹر بلونت سنگھ کے پاس پہنچی۔ اس کے پاس وہ ابھی تک ہے یا نہیں، اس کا مجھے علم نہیں۔

ان تینوں بہنوں کی زندگی کی روئداد اگر لکھی جائے تو ہزاروں صفحے کالے کئے جا سکتے ہیں لوگ مجھے کوستے ہیں کہ میں فحش نگار ہوں، گندہ ذہن ہوں۔ لیکن وہ یہ نہیں سوچتے کہ اس دنیا میں کیسی کیسی ہستیاں موجود ہیں۔ میں انہیں فحش نہیں کہتا۔ میں تو صرف اتنا جانتا ہوں کہ یا تو کوئی آدمی ماحول کے باعث مذمومی حرکات کا مرتکب ہوتا ہے یا اپنی جبلت کے باعث!

جو چیز آپ کو فطرت نے عطا کی ہے ۔ اس کی اصلاح نفسیاتی علاج سے کسی حد تک ہو سکتی ہے۔ لیکن اگر آپ اس سے غافل رہے ہیں، تو اس کی ذمہ داری کس پر عائد ہوتی ہے یہ ذرا سوچنے کی بات ہے ۔

تارہ، ستارہ اور الکندہ تین بہنیں کسی کے ہاں پیدا ہوئیں۔ غالباً نیپال کے کسی گاؤں میں۔ وہاں سے وہ ایک ایک کر کے بمبئی آئیں۔ کہ فلمی دنیا میں قسمت آزمائی کریں لیکن یہ مقدر کی بات ہے کہ صرف ستارہ کا ستارہ چمکا۔ جو باقی دو تھیں وہ ٹمٹماتی رہ گئیں۔

ستارہ کے متعلق جیسا کہ میں اس مضمون کے آغاز میں کہہ چکا ہوں۔ پوری تفصیل سے لکھتے ہوئے جھجکتا ہوں۔ وہ عورت نہیں، کئی عورتیں ہے۔ اس نے اتنے جنسی سلسلے کئے ہیں، کہ میں اس مختصر مضمون میں ان کا احاطہ نہیں کر سکتا۔

انگریزی زبان میں ایسی عورت کو (STAMINA) کہا جاتا ہے۔ یہ عورت کی ایک خاص قسم ہے جو ایک مرد کے علاوہ اور سینکڑوں سے تعلق قائم کرتی ہے۔

ستارہ کا میں جب بھی تصور کرتا ہوں تو وہ مجھے بمبئی کی پانچ منزلہ بلڈنگ معلوم ہوتی ہے۔ جس میں کئی فلیٹ اور کمرے ہوں۔ اور یہ واقعہ ہے کہ وہ بیک وقت کئی مرد اپنے دل میں بسائے رکھتی تھی۔ مجھے اتنا معلوم ہے کہ جب وہ بمبئی میں آئی، تو اس کا تعلق ایک گجراتی فلم ڈائرکٹر سے قائم ہوا۔ جس کا پورا نام مجھے یاد نہیں رہا۔ لیکن وہ ڈیسائی تھا۔ دبلا پتلا مریل قسم کا انسان، لیکن تھا بہت خوبیوں کا مالک، اپنے کام میں کافی ہوشیار تھا۔ مگر قسمت نے اس کی یاوری نہ کی چونکہ ضدی تھا۔ اس لئے جگہ جگہ ٹھکرایا گیا۔ اس سے میری ملاقات اس زمانے میں ہوئی، جب سرحد فلم کمپنی زندہ تھی۔ لیکن اصل میں زندہ درگور تھی۔ میری اس کی فوراً دوستی ہو گئی۔ اس لئے کہ وہ فن شناس تھا اور ادبی ذوق بھی رکھتا تھا۔ اسی دوران میں مجھے معلوم ہوا کہ ستارہ اس کی بیوی ہے لیکن اس سے جدا ہو گئی ہے۔ ڈیسائی کو مگر اس جدائی کا اتنا رنج نہیں تھا۔ اس کی باتوں سے مجھے صرف اتنا معلوم ہوا کہ وہ اس عورت سے پورا نبٹ نہیں سکتا تھا۔

ستارہ اس زمانے میں کسی اور کے پاس تھی لیکن کبھی کبھی اپنے شوہر ڈیسائی کے پاس بھی آجاتی تھی۔ وہ خوددار انسان تھا۔ اس لئے وہ اس سے عموماً بے اعتنائی برتتا تھا۔ اور اسے

مختصر ملاقات کے بعد رخصت کر دیا کرتا تھا۔

ہندوؤں کے مذہب کے مطابق کوئی عورت طلاق نہیں لے سکتی۔ ڈیسائی سے ستارہ کی شادی ہندو قانون کے ماتحت ہوئی تھی۔ اس لئے اب بھی وہ ڈیسائی ہے۔ حالانکہ وہ کئی مردوں سے منسلک ہو کر ان سے علیحدگی اختیار کر چکی ہے۔ میں یہ اس زمانے کی بات کر رہا ہوں جب ڈائرکٹر محبوب کا ستارہ مائل بہ عروج تھا۔ محبوب نے اسے اپنے کسی فلم میں لیا، تو اس کے ساتھ ستارہ کے جنسی تعلقات فوراً قائم ہو گئے۔ اس کی روداد میرا قلم نہیں بیان کر سکتا۔ صرف "بو" (عشرت جہاں) کی زبان ہی بیان کر سکتی ہے۔

آؤٹ ڈور شوٹنگ کے سلسلے میں محبوب کو حیدر آباد جانا پڑا تھا۔ وہاں محبوب صاحب حسب دستور باقاعدہ نماز پڑھتے تھے۔ اور باقاعدہ ستارہ سے عشق فرماتے تھے۔ میں یہ سب کچھ لکھنے میں ہچکچا رہا ہوں۔ اصل میں ستارہ "ایک کیس ہسٹری" ہے۔ اس پر نفسیات کے کسی ماہر ہی کو لکھنا چاہئے تھا۔ بمبئی میں ایک "اسٹڈیو فلم سٹی" تھا۔ محبوب نے غالباً اس میں اپنی کوئی پکچر بنانا شروع کی تھی۔ ان دنوں وہاں ساؤنڈ ریکارڈ کرنے والے مسٹر پی، این اروڑا تھے (جو اب مشہور پروڈیوسر ہیں) بڑے محنتی قسم کے نوجوان، فضل بھائی نے جو فلم سٹی کے کرتا دھرتا تھے، ان کو ولایت بھیجا تھا، کہ وہ صدا بندی کا کام سیکھ کے آئیں۔ اسی زمانے میں سیٹھ شیراز علی حکیم بھی وہیں تھے۔ اور لیبارٹری کے انچارج تھے۔ ڈائرکٹر محبوب سے تو ستارہ کا سلسلہ چل رہا تھا۔ لیکن بقول دیوان سنگھ مفتون ایڈیٹر "ریاست" دہلی اس کا ٹانکا پی، این اروڑا سے بھی مل گیا۔

ڈائرکٹر محبوب نے فلم ختم کیا۔ تو ستارہ پی، این اروڑا کے ہاں بطور بیوی یا داشتہ کے رہنے لگی۔ لیکن اس دوران میں ایک اور حادثہ درپیش آیا۔ فلم سٹی ہی میں یا کسی اور اسٹوڈیو میں جہاں ستارہ کام کر رہی تھی۔ ایک نو وارد الناصر تشریف لائے۔ یہ بڑے خوبصورت جوان تھے۔ کم عمر، تازہ تازہ ڈیرہ دون سے تعلیم حاصل کر کے، گال سرخ و سپید تھے۔ ان کو شوق

تھا کہ فلمی دنیا میں داخل ہوں۔

جب آئے تو فوراً انہیں ایک فلم میں رول مل گیا۔ اتفاق سے اس کے کاسٹ میں ستارہ بھی شامل تھی، جو بیک وقت پی، این اروڑہ، ڈائرکٹر محبوب اور اپنے اصلی خاوند مسٹر ڈیسائی کے پاس آیا جایا کرتی تھی۔

معلوم نہیں یہ پہلے کی بات ہے یا بعد کی، مگر ستارہ کی دوستی نذیر سے بھی ہو گئی، جس کی پہلی داشتہ جو کہ ایک یہودن ایکٹریس یاسمین تھی، اسے داغ مفارقت دے گئی تھی۔ مجھے معلوم نہیں کن حالات میں ان دونوں کی ملاقات ہوئی۔ لیکن میں اتنا ضرور جانتا ہوں، کہ ان دونوں میں گاڑھی چھننے لگی۔ نذیر ستارہ پر فریفتہ تھا، اور ستارہ نذیر پر اپنی جان چھڑکتی تھی۔

میں نذیر کو اچھی طرح جانتا ہوں، وہ بہت سخت مزاج کا آدمی ہے۔ وہ عورت کو تابع رکھنے کا قائل ہے۔ عورت کا ذکر ہی کیا، مرد بھی جو اس کی ملازمت میں ہوں انہیں اس کی گالیاں اور گھرکیاں سہنا پڑتی ہیں۔

وہ آدمی نہیں دیو ہے، لیکن بڑا مخلص دیو۔ وہ میرا دوست ہے۔ جب کبھی مجھ سے ملتا ہے۔ سلام دعا کی بجائے گالیاں دیتا ہے۔ لیکن میں جانتا ہوں کہ وہ بے ریا ہے اس کا دل خلوص سے معمور ہے۔

اس بے ریا اور مخلص آدمی نے ستارہ کو کئی برس برداشت کیا۔ اسکی سخت گیر طبیعت کے باعث ستارہ کو اتنی جرأت نہ ہوئی، کہ وہ اپنے پرانے آشناؤں سے راہ و ربط قائم رکھے۔ لیکن وہ عورت جو صرف ایک مرد کی رفاقت پر قانع نہ رہتی ہو، اس کا کیا علاج ہے۔ ستارہ نے کچھ دیر کے بعد وہی سلسلہ شروع کر دیا۔ جس کی وہ عادی تھی۔ اروڑا الناصر، محبوب، اور اس کا خاوند ڈیسائی سب ہی اس کے التفات سے مستفید ہوتے رہے یہ چیز نذیر کی خوددار طبیعت پر بہت گراں گذرتی تھی۔ وہ ایسا آدمی ہے کہ ایک مرتبہ کسی

عورت سے تعلق قائم کرلے تو اسے نبھانا چاہتا ہے۔ مگر ستارہ کسی اور ہی آب و گل کی بنی تھی، وہ نذیر جیسے آدمی سے بھی مطمئن نہیں تھی۔

میں اس میں ستارہ کا کوئی قصور نہیں دیکھتا، جو کچھ بھی اس سے سرزد ہوا، سراسر اس کی جبلت کے باعث ہوا۔ قدرت نے اس کو اس طور سے بنایا ہے کہ وہ بادۂ ہر جام ہی بنی رہے گی۔ کوشش کے باوجود وہ اپنی فطرت کے خلاف نہیں جا سکتی۔

یاسمین معتدل عورت تھی، خوبصورت، نسوانیت کا بڑا اچھا نمونہ۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ اس نے جب نذیر سے مستقل گھریلو زندگی بسر کرنے کا ارادہ ظاہر کیا، تو نذیر نے، اس نذیر نے جسے ہزاروں اشخاص بہت سخت گیر سمجھتے ہیں، یاسمین کو اجازت دے دی کہ وہ جس کسی کے ساتھ شادی کرنا چاہتی ہے۔ کر سکتی ہے۔

میری سمجھ میں نہیں آتا، کہ نذیر اور ستارہ کا جسمانی تعلق اتنی دیر کیسے قائم رہا نذیر سے میری ملاقات ہندوستان سینے ٹون میں ہوئی۔ یہ وہ زمانہ تھا، جب فلم انڈسٹری نہایت نازک حالت میں تھی۔ وہ اس وجہ سے کہ فائیننسر سٹے باز تھے۔ آج لاکھوں کے مالک ہیں، دوسرے دن دیوالہ پٹ رہا ہے۔

ہندوستان سنے ٹون پہلے سروج فلم کمپنی تھی۔ اس سے پہلے خدا معلوم اس کا کیا نام تھا۔ میں نے ایک کہانی "کیچپٹ" کے عنوان سے لکھی۔ جب میں نے سیٹھ نانو بھائی ڈیسائی کو سنائی، تو اس نے بے حد پسند کی۔ کہ اس زمانہ میں جبکہ حکومت کی طرف سے سخت قسم کا احتساب عائد تھا، کوئی پروڈیوسر اس کہانی کو فلمانے کی جرأت نہیں کر سکتا مگر نانو بھائی دلیر آدمی تھا، اس نے کہانی لے لی۔ مگر بعد میں مالی مشکلات درپیش آئیں۔ تو وہ مجبور ہو گیا۔

نذیر کے لئے میں نے مزدور کا ایک اہم رول لکھا تھا، جو اس کو بہت پسند تھا۔ جب اس کو معلوم ہوا کہ مالی مشکلات کے باعث یہ "باغی فلم" نہیں بنے گا۔ تو اس نے

سیٹھ نانو بھائی ڈیسائی سے کہا کہ آپ یہ کہانی مجھے دے دیجئے۔ میں اپنا سب کچھ بیچ کر اس کے فلمانے پر لگا دوں گا۔ مگر ایسی نوبت نہ آئی۔ نانو بھائی کو کہانی پسند تھی چنانچہ کسی نہ کسی طرح سرمائے کا بندوبست ہو گیا۔ فلم کے ڈائرکٹر دادا گنجال تھے — گجراتی۔ مکمل ہو کر ریلیز ہو گیا۔ لوگوں نے اس کی تعریف کی، پسند کیا، مگر میں مطمئن نہ تھا لیکن اس کا میرے موضوع سے کوئی اتنا زیادہ تعلق نہیں، مجھے صرف یہ کہنا تھا، کہ اس دوران میں نذیر کو اپنی ذاتی فلم کمپنی قائم کرنے کی خواہش پیدا ہو گئی۔ اسی زمانے میں یاسمین اس سے رخصت ہونے کی تیاریاں کر رہی تھی۔ نذیر عزم کا مالک ہے۔ اس نے بہت جلد اپنا ذاتی فلم بنانے کا ارادہ کر لیا۔ چنانچہ جہاں تک میرا حافظہ کام دیتا ہے۔ اس کا پہلا فلم "سندیسہ" تھا۔

اس کے بعد اس نے اپنا دوسرا فلم بنایا، جس کا نام غالباً "سوسائٹی" تھا۔ اس میں اس نے ستارہ کو بھی کاسٹ میں شامل کیا۔ اور جو نتیجہ ہوا، وہ ظاہر ہے کہ وہ دونوں ایک دوسرے میں مدغم ہو گئے۔ اور بہت دیر تک رہے۔ لیکن اس دوران میں جہاں تک میں جانتا ہوں، ستارہ اپنے پرانے دوستوں کے ہاں بھی آتی جاتی رہی۔ پی این اروڑہ کے پاس وہ اکثر جاتی تھی۔

میں آپ کو ایک دلچسپ لطیفہ سناؤں۔ مجھے بمبئی چھوڑ کر دہلی جانا پڑا۔ وہاں میں نے آل انڈیا ریڈیو کی ملازمت اختیار کی۔ قریب قریب ایک سال تک میں بمبئی کی فلمی دنیا کے حالات و کوائف سے غافل رہا۔ ایک دن اچانک میں نے نئی دلی میں اروڑہ کو دیکھا۔ ہاتھ میں موٹی چھڑی، کمر دوہری ہو رہی تھی۔ یوں بھی بے چارہ منحنی قسم کا انسان ہے۔ مگر اس وقت بہت خستہ حالت میں تھا۔ بڑی مشکل سے قدم اٹھا رہا تھا، جیسے اس میں جان ہی نہیں۔ میں تانگے میں تھا اور وہ پیدل۔ غالباً چہل قدمی کے لئے نکلا تھا۔ میں نے تانگہ رکوایا اور اس سے پوچھا کہ یہ قصہ کیا ہے۔ اس کا حلیہ کیوں اتنا بگڑا ہے؟ اس نے ہانپتے ہوئے مگر ذرا پھیکی سی مسکراہٹ کے ساتھ کہا "ستارہ... ستارہ۔" میں سب سمجھ گیا۔

میرا خیال ہے آپ کو بھی سمجھ جانا چاہیے۔

اب ایک اور لطیفہ سنئے۔ الناصر جو اب بہت موٹا اور بھدا ہو گیا ہے، جب ستارہ [illegible] رع میں فلم سٹی آیا تھا۔ تو بہت خوبصورت تھا۔ بڑا نرم و نازک، سرخ و سپید [illegible] دون کی پہاڑی فضا نے اس کو نکھار دیا تھا۔ میں تو یہ کہوں گا، کہ وہ نسائیت کی حد تک خوبصورت تھا۔ اس میں وہ تمام ادائیں تھیں جو ایک خوبصورت لڑکی میں ہوتی ہیں۔ میں جب دہلی میں ڈیڑھ برس گذارنے کے بعد سید شوکت حسین رضوی کے بلانے پر بمبئی پہنچا، تو اس سے میری ملاقات مرزا موودی ٹون میں ہوئی۔ وہ گیٹ کے باہر کھڑا تھا۔ میں حیرت زدہ ہو گیا۔ گالوں کا گلابی رنگ ندارد۔ جسم پر پتلون ڈھیلی ڈھالی ایسا معلوم ہوتا تھا، کہ وہ سکڑ گیا ہے۔ سنچر لگ گیا ہے۔ میں نے اس سے بڑے تشویش بھرے لہجہ میں پوچھا۔ "میری جان، یہ تم نے اپنی کیا حالت بنالی ہے؟" اس نے اپنا منہ میرے کان کے پاس لا کر سرگوشی میں کہا "ستارہ —— میری جان —— ستارہ۔"

جہاں دیکھو ستارہ —— میں نے سوچا کہ یہ ستارہ صرف زردیاں پیدا کرنے کے لئے پیدا ہوئی ہے۔ ادھر پی، این اروڑہ انگلینڈ کا تعلیم یافتہ صدا بند۔ ادھر ڈیرہ دون کے اسکول کا پڑھا ہوا نوخیز لڑکا۔

الگ لے جا کر جب میں نے اس سے پوری تفصیل پوچھی، تو اس نے مجھے بتایا کہ وہ ستارہ کے چکر میں پڑ گیا تھا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ بیمار ہو گیا۔ جب اس کو اس بات کا احساس ہوا کہ اگر وہ زیادہ دیر تک اس چکر میں رہا، تو وہ ختم ہو جائے گا۔ تو وہ ایک روز ٹکٹ کٹا کر ڈیرہ دون چلا گیا۔ جہاں اس نے تین مہینے ایک سینے ٹوریم میں گذارے اور اپنی کھوئی ہوئی صحت کسی قدر حاصل کی۔ اس نے مجھ سے یہ بھی کہا کہ وہ اس دوران میں مجھے ہندی زبان میں بڑے لمبے لمبے خط لکھتی رہی۔ لیکن میں یہ خط پڑھ نہیں سکتا تھا۔ البتہ ان کی آمد سے کانپ ضرور جاتا تھا۔ اس نے پھر میرے کان میں کہا۔

"منٹو صاحب، بڑی عجیب و غریب عورت ہے۔"

ستارہ اصل میں ہے ہی عجیب و غریب عورت، ایسی عورتیں لاکھ میں دو [illegible] تی ہیں۔ میں جانتا ہوں کہ وہ کئی مرتبہ خطرناک طور پر بیمار ہوئی۔ اس کو ایسے ایسے عارضے لاحق ہوئے کہ عام عورت کبھی جانبر نہ ہو سکتی۔ مگر وہ ایسی سخت جان ہے کہ ہر بار موت کو غچہ دیتی رہی۔ اتنی بیماریوں کے بعد خیال تھا، کہ اس کے ناچنے کی قوتیں سلب ہو جائیں گی۔ مگر وہ اب بھی اپنے عہد جوانی کی طرح ناچتی ہے۔ ہر روز گھنٹوں ریاض کرتی ہے۔ مالشیے سے تیل کی مالش کراتی ہے۔ اور وہ سب کچھ کرتی ہے جو پہلے کرتی آئی ہے۔ اس کے گھر میں دو نوکر ہوتے ہیں۔ ایک مرد ایک عورت۔ مرد عام طور پر اس کا مالشیا ہوتا ہے۔ جو عورت ہے اس کے متعلق میں صرف اتنا ہی کہہ سکتا ہوں، کہ وہ پرانی کہانیوں کی کٹنی معلوم ہوتی ہے۔ جو آسمان میں تھگلی لگایا کرتی تھی۔

وہ ململ کی باریک ساڑھی پہنتی ہے، اتنی باریک کہ اس کا سارا ڈھیلا ڈھالا جسم اس میں سے چھن چھن کر باہر آتا رہتا ہے۔ اور دیکھنے والوں کے لئے کراہت کا موجب ہوتا ہے یہ عورت میں نے جب بھی دیکھی بہت کم گو، مگر بڑی تیز نظر دیکھی۔ اس کی عمر کم از کم پچپن برس کے قریب ہو گی۔ مگر وہ جوانوں کی مانند چاق و چوبند تھی۔ اس کی آنکھیں عقاب کی طرح دیکھتی تھیں۔

جب ستارہ اکیلی تھی۔ یعنی وہ کسی ایک کی ہو کے نہیں رہتی تھی، تو اس کا مکان دادر کے "خداداد سرکل" میں تھا اور جو صفتیں یا قباحتیں ستارہ میں ہیں، وہ بھی خداداد ہیں۔ نذیر جو اب سورن لتا سے منسلک ہے۔ بڑی خوبیوں کا مالک ہے۔ اس نے بہت دیر تک ستارہ کو برداشت کیا۔ مگر جیسا کہ میں اس سے پیشتر عرض کر چکا ہوں، وہ ایک مرد کی عورت نہیں ہے۔ چنانچہ جب نذیر تنگ آ گیا اور اس کو حتمی طور پر معلوم ہو گیا کہ وہ اس سے نباہ نہیں کر سکتا، تو اس نے ایک روز اس سے ہاتھ جوڑ کر کہا۔ "ستارہ مجھے بخش دو۔ مجھ

سے جو غلطی ہوگئی میں اس کے لئے پشیمان ہوں۔ اور تم سے معافی کا خواستگار۔"

نذیر ستارہ کو مارا پیٹا بھی کرتا تھا۔ وہ اس سے ناخوش نہیں تھی۔ ایسی عورتیں زدوکوب سے ایک خاص قسم کی جنسی لذت محسوس کرتی ہیں، مگر ان سے منسلکہ مرد کب تک ہاتھا پائی کرتا رہے۔ وہ غریب بھی ایک عرصے کے بعد عاجز آجاتا ہے۔ اب اسی سلسلے کی ایک اور کڑی کے متعلق بھی سنئے۔

جس زمانے میں ستارہ نذیر کے یہاں تھی۔ اسی زمانے میں نذیر کا بھانجا کے آصف بھی وہیں تھا۔ کے آصف بڑا تنومند نوجوان تھا۔ بڑا ہٹا کٹا، جوانی سے بھرپور جسکو عورت ذات سے شاید کبھی سابقہ ہی نہیں پڑا تھا۔ اپنے ماموں کے ہاں رہتا تھا۔ اور اس سے فلم صنعت کے متعلق واقفیت حاصل کر رہا تھا۔ دل میں سینکڑوں ولولے تھے۔ بڑے ارمان لے پھر فلمی دنیا میں آکر اس نے عورتوں (اور وہ بھی ایکٹریسوں) کو قریب سے دیکھا تھا۔ اس کے علاوہ اس نے اپنے ماموں نذیر اور ستارہ کے باہمی تعلقات بھی اپنی آنکھوں سے دیکھے تھے یہ وہ زمانہ تھا، جب کے آصف کی جوانی پھوٹی پڑتی تھی۔ یہ وہ دور تھا، جب مرد اپنی جوانی کے جوش میں پتھروں کی دیوار سے بھی بھڑ جانا چاہتا ہے۔ اور ستارہ یقیناً ایک پتھریلی دیوار تھی جو کسی سے ٹکرانا چاہتی تھی۔

نذیر اس زمانے میں رنجیت فلم اسٹوڈیو کے عین سامنے ایک احاطے کے اندر رہتا تھا۔ بڑی غلیظ سی جگہ تھی۔ نذیر نے ایک پورا فلیٹ لے رکھا تھا۔ اسی میں اس کی قائم کی ہوئی "ہند پکچرز" کا دفتر بھی تھا۔ دو تین کمرے تھے۔ ان میں تخلیہ کیا ہو سکتا تھا۔ چنانچہ پُرجوش نوجوان آصف کو ہر وہ پہلو دیکھنے کا موقعہ ملا، جو مرد و زن کے باہمی تعلقات سے وابستہ ہوتا ہے۔

نوجوان آصف کے لئے یہ ایک نیا تجربہ تھا، بڑا حیرت انگیز، اس نے اپنے شادی شدہ دوستوں سے ازدواجی زندگی کے اسرار کئی بار سنے تھے۔ مگر اسے کبھی تعجب نہیں ہوا تھا

اس کو معلوم تھا کہ ایک بستر ہوتا ہے۔ جس پر انسانی فطرت اپنا ازلی و ابدی کھیل کھیلتی ہے۔ مگر آصف کی آنکھوں نے جو کچھ ایک بار محض اتفاق سے دیکھا وہ بالکل مختلف تھا — بڑا خوفناک، جس نے اس کی ہڈی ہڈی جھنجھوڑ دی۔ اس نے کئی بار کتوں کی لڑائی دیکھی تھی۔ جو ایک دوسرے سے بڑے وحشتناک طریقے پر گتھ جاتے تھے۔ ایک دوسرے کو جھنجھوڑتے بھنبھوڑتے، کاٹتے اور نوچتے تھے۔ اس کا تن بدن لرز گیا۔ اس نے سوچا یہ محبت وحبت سب بکواس ہے۔ اصل میں انسان درندہ ہے اور اس کی محبت ایک بڑی خوفناک قسم کی کشتی۔ مگر اس کو اکھاڑے میں اترنے اور ایسی کشتی لڑنے کا شوق تھا۔ اس کے بازوؤں میں قوت تھی۔ اس کے بدن میں حرارت تھی۔ اس کے تمام پٹھے فولادی تھے۔ اس کی خواہش تھی کہ صرف ایک بار اسے موقعہ دیا جائے تو وہ حریف کو چاروں شانے چت گرا دے۔

اس زمانے میں ڈائرکٹر نیر (پاکستان کا ذہین مگر بدقسمت ڈائرکٹر) بھی نذیر کے ساتھ تھا۔ آصف اور وہ دونوں ہم عمر تھے۔ دونوں کنوارے اور خوابوں کی دنیا میں رہنے والے، آپس میں ملتے تو وہ عورتوں کی باتیں کرتے، ان عورتوں کی جو مستقبل میں ان کی ہونے والی تھیں۔ پر جب ستارہ کا ذکر آتا، تو دونوں کانپ اٹھتے، اور ایک ایسی دنیا میں چلے جاتے جہاں جن، دیو، اور چڑیلیں ہوتی ہیں۔

ان کو کیا معلوم تھا، کہ "نمفومینک" عورت کیا ہوتی ہے۔ ان کو کیا معلوم، کہ ستارہ کے مقابلہ میں ایسی عورتیں بھی ہیں، جنہیں اگر برف کی سل کہا جائے تو بجا ہے۔ لیکن ان کو اتنا معلوم تھا، کہ ستارہ نذیر کے ساتھ وفادار نہیں وہ ہرجائی ہے۔ یوں تو نذیر کی "ہول ٹائم" داشتہ کے طور پہ رہتی ہے۔ مگر پی، این اروڑہ کے پاس بھی جاتی ہے۔ اور کبھی کبھی اپنے پنی ڈیسائی کے پاس بھی، جو بے چارہ بڑے حسرت کے دن گذار رہا تھا — اور پھر اور بھی تھے، جن میں ناصر شامل تھا۔

دونوں چکرائے چکرائے رہتے تھے۔ ان کی سمجھ میں کچھ نہیں آتا تھا۔ نذیر کے بستر کی ہر شکن کا پس منظر ان کو معلوم تھا۔ نذیر کے کھردرے اور گہرے سانولے رنگ کے چہرے کی گینڈے ایسی سخت کھال پر جو آئے دن داغ دھبے پڑتے تھے۔ اس کا جواز بھی ان کو معلوم تھا لیکن اس قدر دونوں کو یقین تھا کہ یہ سلسلہ زیادہ دیر تک نہیں چلے گا۔ مگر وہ چلتا رہا اپنے معمول کے مطابق۔

صبح سویرے ستارا اُٹھتی اور دوسرے کمرے میں ریاض شروع کر دیتی۔ یہ بھی ایک حیرتناک چیز تھی، کہ صبح اُٹھتے ہی دو گھنٹے لگاتار وحشیوں کی مانند ناچتی رہے۔ ایسے ایسے توڑے لے کہ زمین گھوم جائے۔ طبلچی کے ہاتھ شل ہو جائیں۔ مگر اسے کچھ نہ ہو۔ ریاضت کے بعد وہ اپنے ایک مخصوص مالشیے سے مالش کراتی تھی۔ اس کے بعد نہا دھو کر وہ نذیر کے کمرے میں جاتی، جو کہ سو رہا ہوتا۔ اس کو جگاتی اور اپنے ہاتھ سے دودھ یا خدا معلوم کس چیز کا ایک پیالہ اسے زبردستی پلاتی۔ اور ایک دوسرا ناچ شروع ہو جاتا یہ سب کچھ آصف اور نیرؔ کی آنکھوں کے سامنے ہو رہا تھا۔ ان کی عمر تجسّس کی عمر تھی۔ جب آدمی خالی کمروں میں بھی خواہ مخواہ کھڑکی کی درزوں سے جھانک کر دیکھتا ہے۔ روشن دانوں سے بھرے کمرے کا جائزہ لیتا ہے۔ ذرا سی آواز آنے پر اس کے کان کھڑے ہو جاتے ہیں۔ اور وہ ان میں معانی بھرنے کی کوشش کرتا ہے۔ نیرؔ آصف کے مقابلے میں جسمانی لحاظ سے بہت کمزور تھا۔ اس کی جنسی خواہشیں بھی اسی لحاظ سے معتدل تھیں۔ مگر آصف کے مضبوط اور تنومند جسم کی رگ رگ میں بجلی بھری ہوئی تھی۔ جو کسی پر گرنا چاہتی تھی۔ اسی لئے آصف چاہتا تھا، کہ اندھیری رات ہو، آسمان پر کالے بادلوں کا ہجوم ہو، کان بہرے کر دینے والی بجلی کی کڑک اور طوفانِ باد و باراں میں وہ کسی کا ہاتھ مضبوطی سے پکڑے اور اسے کھینچتا کہیں دور لے جائے۔ جہاں پتھروں کا بستر ہو۔

نذیر کا عزیز ہونے کے باعث ستارہ گھنٹوں آصف کے پاس بیٹھی رہتی۔ اور

ادھر ادھر کی باتیں کرتی رہتی تھی۔ جوں جوں وقت گذرتا گیا، آصف کا حجاب کم ہوتا گیا۔ جو وہ لاہور سے اپنے ساتھ لایا تھا۔ مگر اس کو اتنی جرأت نہیں تھی، کہ وہ ستارہ کو ہاتھ لگاتا۔ کیونکہ وہ اپنے ماموں کی سخت گیر طبیعت سے واقف تھا۔ اور اس سے ڈرتا تھا لیکن اس دوران میں اتنا جان گیا تھا کہ ستارہ اس کی طرف مائل ہے۔ وہ جب بھی چاہے اس کی کلائی اپنے مضبوط ہاتھ میں پکڑ کر اسے جہاں چاہے لے جا سکتا ہے ـــــ مگر وہ گھپ اندھیری رات، وہ طوفان باد و باراں اور وہ پتھروں کا بستر!

آصف جھنجھلا رہا تھا کہ قدرت اتنی تعویق کیوں کر رہی ہے۔ جو ہونا ہے آج ہی کیوں نہیں ہو جاتا۔ گاڑیاں جنہیں کل ایک دوسرے سے ٹکرانا ہے، آج ہی کیوں نہیں ٹکرا جاتیں۔ مگر یہ کیسے ہوتا۔ جب کانٹا بدلنے والا کانٹا نہ بدلتا۔

وہ دو گاڑیوں کی طرح ایک پلیٹ فارم پر رُکے تھے۔ مگر ان میں فاصلہ ہوتا تھا بہت معمولی سا فاصلہ۔ مگر جس طرح ایک گاڑی دوسری گاڑی سے ہمکنار نہیں ہو سکتی۔ اس لیے کہ وہ اپنی اپنی پٹڑیوں کے ساتھ جکڑی ہوتی ہیں۔ اسی طرح وہ بھی ایک دوسرے سے ہمکنار نہیں ہو سکتے تھے۔

جس طرح اِدھر کے مسافر اُدھر کے مسافروں سے کھڑکیوں میں سے سر باہر نکال نکال کر باتیں کرتے ہیں اسی طرح وہ بھی کرتے تھے۔ مگر فوراً ایک گاڑی اُدھر روانہ ہو جاتی اور دوسری اِدھر۔ آصف کو بڑی جھنجھلاہٹ ہوتی تھی۔ مگر وہ گھپ اندھیری رات اور طوفان باد و باراں کا منتظر تھا۔

آخر وہ گھپ اندھیری رات، طوفان باد و باراں، رعد و برق کی جملہ ہولناکیوں کے ساتھ آ ہی گئی۔

بالآخر ستارہ کے کرتوت دیکھ کر نذیر بھونچکا ہو کے رہ گیا۔

نذیر کے سر سے اب پانی گذر چکا تھا۔ کافی لعن طعن کے بعد اس نے ستارہ سے

کہا کہ اب تم یہاں نہیں رہ سکتیں۔ اپنا بستر فوراً گول کرو۔

ستارہ کچھ بھی ہو، آخر عورت ذات ہے۔ نذیر کی سرزنش کے بعد اس میں اتنی طاقت نہیں تھی۔ کہ وہ اکیلی اپنا بستر گول کر سکتی۔ نذیر سے وہ کیسے مدد مانگتی۔ وہ غصے میں بھرا، منہ میں جھاگ نکالتا باہر نکل کر اپنے دفتر میں جا بیٹھا۔ آصف نے اس کے یہ تیور دیکھے تو اس کو یقین ہو گیا کہ وہ اندھیری رات آ گئی۔

تھوڑی دیر وہ خاموش بیٹھا رہا۔ اس کے بعد اُٹھا اور آہستہ آہستہ دوسرے کمرے میں پہنچ گیا۔ جہاں ستارہ دوسرے کمرے میں بیٹھی اپنی چوٹیں سہلا رہی تھی۔

چند باتوں ہی سے اس کو معلوم ہو گیا، کہ معاملہ ختم ہے۔ دل ہی دل میں وہ بہت خوش ہوا۔ چنانچہ اس نے ستارہ کو ڈھارس دی، کچھ اس طور پر کہ ایک نیا معاملہ شروع ہو گیا۔

آصف نے اس کا بستر بوریا باندھا۔ اور اس کے ساتھ اس کے گھر (واقع دادر خداداد سرکل) چھوڑنے گیا۔

یہاں ستارہ نے آصف کا بہت بہت شکریہ ادا کیا۔

آصف نے جرأت سے کام لے کر ستارہ کا ہاتھ پکڑ لیا۔ اور کہا۔ "اس کی کیا ضرورت تھی ستارہ۔"

ستارہ نے اپنا ہاتھ آصف کی گرفت سے چھڑانے کی کوشش نہ کی۔ مگر آصف مطمئن نہ تھا۔ تھوڑی دیر راز و نیاز کی باتیں ہوئیں۔ ستارہ نے آصف کو اپنے اس سحر کا نمونہ بھی چکھایا، جس سے وہ اس وقت تک سینکڑوں مرد، دُبلے پتلے، ہٹے کٹے، ضدی اور وحشی اپنی خواہشات کا غلام بنا چکی تھی۔

اگر دن ہوتا تو آصف کو یقیناً تارے نظر آ جاتے۔ مگر رات کو اسے خداداد سرکل کے اس فلیٹ میں دن طلوع ہوتا نظر آیا۔ اس کی مسرتوں کا دن، مگر وہ پھر بھی مطمئن نہ تھا

اس نے ستارہ سے کہا کہ دیکھو، تمہارا میرا سمبندھ بہت مضبوط ہونا چاہیئے۔ ہر جائی پن چھوڑ دو۔ بس ایک کی ہو جاؤ۔

ستارہ نے اسے یقین دلایا، کہ وہ آصف کے سوا کسی کی طرف آنکھ اُٹھا کر بھی نہ دیکھے گی۔ آصف مطمئن ہو گیا۔ مگر اس خوف سے کہ نذیر اس سے اتنی دیر لگانے کی وجہ نہ پوچھ بیٹھے۔ عاشق صادق کی طرح اس کا ہاتھ چوم کر چلا گیا۔ اور وعدہ کر گیا کہ وہ دوسرے روز ضرور آئے گا۔

وہ گیا تو ستارہ اٹھی، سنگار میز کے پاس جا کر اس نے اپنے بال درست کیے۔ ساڑھی تبدیل کی۔ اور کسی کی طرف آنکھ اُٹھائے بغیر نیچے اُتری۔ اور ٹیکسی لے کر پی، این اروڑہ کے پاس چلی گئی۔

جملہ معترضہ ہے لیکن ہوا کرے۔ کہنا یہ ہے کہ ستارہ کو مجھ سے سخت نفرت تھی۔ میں "مصور" کا ایڈیٹر تھا۔ اور بے لاگ لکھتا تھا۔ بال کی کھال اور نت نئی کے کالموں میں کئی بار میں نے اس کی دُرگت بنائی تھی۔ لیکن بڑے سلیقے سے۔ اس میں کوئی ساقیانہ پن نہیں ہوتا۔ پھر بھی وہ ناراض تھی۔ اور مجھے اس ناراضی کی ہیچ پوچھے تو کوئی پروا بھی نہیں تھی۔ اس لئے کہ مجھے اس سے کوئی غرض نہیں تھی۔ اور یوں بھی فلمی ہستیوں سے دور دور ہی رہتا تھا۔

میں نے "نت نئی" یا "بال کی کھال" کے کالموں میں جب نذیر اور اس کی لڑائی کا ذکر ذرا نمک مرچ لگا کے کیا تو وہ بہت سیخ پا ہوئی۔ اور اس نے مجھے خوب خوب گالیاں دیں۔

اس کے بعد جب مجھے اپنے جاسوسوں کے ذریعہ سے آصف اور اس کے خفیہ معاشقے کا پتہ چلا اور میں نے چبھتے ہوئے اشاروں اور کنایوں میں اس کا ذکر اپنے کالموں میں کیا۔ تو وہ بھنا گئی۔ اور اس نے آصف سے کہا۔ تم اس شخص کو پیٹتے کیوں نہیں

خود نہیں پیٹتے تو کسی سے پٹواؤ۔ یا کسی اور اخبار والے سے کہو کہ وہ اسے اپنے اخبار میں ڈھیروں کے ڈھیر گالیاں دے۔

آصف بڑے ظرف کا آدمی ہے۔ اس میں بردباری ہے، تحمّل ہے۔ مذاق سمجھنے کی اہلیت رکھتا ہے۔ حالانکہ اَن پڑھ ہے۔ اس نے ستارہ کی یہ باتیں اس کان سُنیں اس کان نکال دیں۔

معاملہ اب زیادہ نزاکت اختیار کر گیا تھا۔ یہ تو آپ کو معلوم ہو چکا ہے، کہ ستارہ کس قسم کی عورت ہے۔ اگر اس سے کسی مرد کا واسطہ پڑ جائے، تو اس کی رہائی مشکل ہو جاتی ہے۔ فقط ایک ناصر ہی تھا، جو چند ماہ اس کے ساتھ گذار کر ڈیڑھ دو ن بھاگ گیا۔ ورنہ ایک روز اس کی انتڑیاں بالکل جواب دے دیتیں۔ اور اس کی قبر بمبئی کے کسی قبرستان میں بنی ہوئی ہوتی جس کے کتبے پر کچھ اس قسم کا شعر مرقوم ہوتا ؎

لحد پہ مری وہ پردہ پوش آتے ہیں
چراغ گورِ غریباں صبا، بجھا دینا

ہاں تو معاملہ بہت نزاکت اختیار کر گیا تھا۔ اس لئے کہ نذیر کے دل میں شکوک پیدا ہو رہے تھے۔ وہ سوچتا تھا، یہ میرا بھانجا اتنی اتنی دیر کہاں غائب رہتا ہے۔ جب وہ اس سے پوچھتا تو وہ کوئی بہانہ پیش کر دیتا۔

مگر یہ بہانے کب تک چلتے۔ اس کا اسٹاک ایک روز ختم ہونا ہی تھا۔

نذیر کے دل میں ستارہ کے لئے اب کوئی جگہ نہیں تھی۔ وہ ایسا آدمی نہیں کہ اپنا فیصلہ تبدیل کر دے۔ اس کو ستارہ کی نہیں آصف کی فکر تھی۔ اپنے بھانجے کی، جس کو وہ اپنا عزیز سمجھتا تھا۔ اور جس کو اس نے صرف اس غرض سے اپنے پاس رکھا تھا کہ وہ کچھ بن جائے۔

البتہ اس کو فکر تھی کہ وہ کہیں اس عورت کے ہتھے نہ چڑھ جائے۔ وہ اس عورت کے ساتھ کئی برس گذار چکا تھا۔ اس کی رگ رگ اور نخ نخ سے واقف تھا اس کو معلوم تھا کہ آصف جیسے نوجوان اس کا من بھاتا کھاجا ہیں۔ اور ان کو اپنے دام میں پھنسانا اس جیسی تجربہ کار عورت کے لئے کچھ مشکل نہ تھا۔ لطف کی بات تو یہ ہے کہ وہ خود بخود اس کے دام کے نیچے آجاتے تھے۔ ایک بار پھنس جاتے تو پھر رہائی مشکل ہو جاتی تھی۔

ستارہ سے کسی مرد کا سابقہ پڑ جائے اور اتفاق سے وہ ستارہ کو پسند آجائے تو پھر دن اور رات کا بیشتر حصّہ اسی کے ساتھ کاٹنا پڑتا ہے۔ نذیر کو آصف کی پے در پے غیر حاضریوں ہی سے پتہ چل گیا تھا، مگر جب آصف کہتا کہ ماموں جان، یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں؟ میں اس کے متعلق تو سوچ بھی نہیں سکتا۔ تو وہ شش و پنج میں پڑ جاتا، لیکن دل میں اسے پورا یقین تھا، کہ یہ لونڈا پھنس چکا ہے، اور جھوٹ بول رہا ہے۔

آصف واقعی جھوٹ بول رہا تھا۔ معاملہ اگر کسی اور عورت کا ہوتا، تو وہ یقیناً کبھی جھوٹ نہ بولتا۔ مگر ستارہ اس کے ماموں کی داشتہ تھی۔ اس کے ساتھ وہ ایسے تعلقات قائم نہیں کر سکتا تھا۔ وہ تعلقات جو قائم ہو چکے تھے۔

پیچھے ہٹنا اور فرار اب بہت مشکل تھا۔ آصف اس "زنِ تسمہ پا" کی گرفت میں تھا۔ بھاگ نکلنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ مگر ادھر نذیر کی آنکھوں میں برابر خون اتر رہا تھا۔ اس کو بس ایک موقعہ چاہیے تھا۔ ایسا موقعہ کہ وہ سب کچھ خود اپنی آنکھوں سے دیکھے۔

ایک روز نذیر نے وہ سب کچھ دیکھ بھی لیا۔ جو وہ خود اپنی آنکھوں سے دیکھنا چاہتا تھا۔ میرا حافظہ میرا ساتھ نہیں دیتا۔ مجھے سارے واقعات اچھی طرح معلوم تھے۔

مگر اب اتنا عرصہ گذر گیا ہے کہ بہت سی باتیں ذہن سے اُتر گئی ہیں۔ وہ خون جو نذیر کی آنکھوں میں ایک عرصے سے اتر رہا تھا، وہ اس وقت پی گیا اور ان دونوں پر ٹوٹ پڑا۔

آصف نے اپنے ماموں کو قسمیں کھا کھا کر یقین دلانے کی کوشش کی۔ کہ وہ دونوں بے گناہ ہیں۔ ان کے درمیان ایسا کوئی رشتہ، ایسا کوئی تعلق نہیں، جس کے لئے انہیں موردِ عتاب بنایا جائے۔ لیکن نذیر اس وقت کچھ بھی سننے کے لئے تیار نہیں تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا، کہ وہ مار مار کے ان دونوں کی ہڈی پسلیاں توڑ دینا چاہتا ہے، تاکہ سارا قصہ ہی ختم ہو۔ مگر مجید (مشہور ایکٹر جو اب پاکستان میں ہے) نے بڑی ہوشیاری سے بیچ بچاؤ کر دیا۔

نذیر مان گیا۔ وہ بہت کم کسی کی مانا کرتا ہے۔ مگر ان دونوں مجید انگریزی محاورے کے مطابق اس کی "اچھی کتابوں" میں تھا۔

مجید کو آصف اور ستارہ کے معاشقے کا علم تھا۔ سُنا ہے کہ اس نے آصف کو کئی بار متنبہ کیا تھا کہ وہ اس خطرناک کھیل سے باز آجائے۔ مگر جوانی کے وہ دیوانے دن جن میں سے آصف کی زندگی گذر رہی تھی۔ نہ مانے۔ اور نتیجہ اس کا یہ ہوا کہ وہ راز جن کو وہ اپنی دانست کے مطابق بڑے دبیز پردوں کے اندر چھپائے بیٹھے تھے۔ فاش ہو گیا۔

نذیر جیسا کہ میں اس سے پہلے عرض کر چکا ہوں۔ بہت سخت گیر آدمی ہے۔ مگر ایسے بہت کم آدمی ہیں، جن کو معلوم ہے کہ وہ نرم دل بھی ہے۔ جو کام وہ خود کرتا ہے، اس کی اچھائی برائی کا شعور رکھتا ہے۔ جو اوسط درجے کا آدمی نہیں رکھتا۔ وہ ستارہ سے ایک عرصے تک جسمانی طور پر وابستہ رہا۔ لیکن وہ نہیں چاہتا تھا، کہ یہ وابستگی آصف کی بھی ستارہ سے ہو۔

آصف اس کا بھانجا تھا۔ کہا جا سکتا ہے کہ وہ اسی رشتے کی بنا پر آصف اور

ستارہ کا ملاپ پسند نہیں کرتا تھا۔ مگر میں جو نذیر کے کردار کے تمام ٹیڑھے ترچھے زادیوں سے واقف ہوں، وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ اگر آصف کی بجائے کوئی اور آدمی ہوتا، تو وہ اس سے بھی یہی کہتا کہ دیکھو اس عورت سے بچو۔ ایک صرف میں ہی تھا جسے اپنی توانائی اور قوت پر ناز تھا لیکن میں بھی ہار گیا۔

نذیر خلوص کا پتلا ہے۔ ایک ایسے خلوص کا، جو ہر وقت بڑا درشت اور کھردرا لباس پہنے رہتا ہے۔

نذیر نے مجید کے کہنے پر ستارہ اور آصف دونوں کو چھوڑ دیا۔ اس لئے بھی، کہ آصف نے اپنے ماموں کو یقین دلایا تھا، کہ ان دونوں کے تعلقات بالکل پاک اور صاف ہیں۔

نذیر چلا گیا۔ مگر وہ مطمئن نہیں تھا۔ بہ ظاہر وہ ایک اکھڑ آدمی معلوم ہوتا ہے۔ شے لطیف سے کورا، مگر وہ دوسروں کے دل کی گہرائیوں میں ایک ماہر غوطہ زن کی طرح اتر سکتا ہے۔ اور پھر وہ ستارہ کی ایک ایک رگ سے واقف تھا۔ اور جس عمر سے آصف گذر رہا تھا۔ اس میں تو وہ چھلانگیں لگاتا گذر چکا تھا۔ اس نے ایسی کئی منزلیں دیکھی تھیں، جو آصف شاید ساری عمر نہ دیکھ سکے۔ وہ مطمئن نہیں تھا۔

اس حادثے کے بعد آصف اور ستارہ کے درمیان کچھ دیر باتیں ہوئیں۔ وعدے وعید ہوئے، قسمیں کھائی گئیں کہ وہ کبھی ایکدوسرے سے جدا نہ ہوں گے۔ وغیرہ وغیرہ۔ اس کے بعد آصف نے سچے عاشقوں کے انداز میں ستارہ سے رخصت لی اور چلا گیا۔

ستارہ نے اپنا میک اپ درست کیا۔ نئے کپڑے پہنے اور ٹیکسی منگوا کر پی، این اروڑہ کے پاس چلی گئی۔ جس کی صحت دہلی کے حکیموں کے علاج سے اب کسی قدر بحال ہو چکی تھی۔ اور اس کے پچکے ہوئے گالوں میں تھوڑا سا گوشت آگیا تھا۔

الناصر بھی تھا۔ ڈاکٹر محبوب بھی تھے۔ اور خدا معلوم اور کتنے تھے۔ آصف گویا ایک

بہت ہی کڑے مرحلے سے گذر چکا تھا۔ مگر اس نے ستارہ کے یہاں اپنی آمد و رفت یکسر منقطع نہ کی۔ اور وہ کر بھی کیسے سکتا تھا جبکہ پرانی جادوگرنیوں کی طرح اس جادوگرنی نے آصف کو ایک مکھی بنا کر اپنی دیوار کے ساتھ چپکا رکھا تھا۔ اب صرف نجات کا ایک ہی راستہ تھا کہ پرانی کہانیوں کا کوئی شہزادہ سلیمانی تعویذ کے ذریعے سے اس جادوگرنی کا مقابلہ کرتا اور انجام کار آصف اس کے چنگل سے نکلتا۔

میں جانتا ہوں اور اچھی طرح جانتا ہوں، کہ طاقتور سے طاقتور سلیمانی تعویذ بھی ستارہ پر اثر انداز نہیں ہو سکتا۔ وہ ایک ایسا حصار ہے، جسے لنڈھور بھی سر نہیں کر سکتا۔

یہ چکر یوں ہی چلتا رہا۔ نذیر اور آصف کے تعلقات روز بروز کشیدہ ہوتے چلے جا رہے تھے۔

ہاں، میں ایک بات بتانا بھول ہی گیا۔ جب نذیر نے ستارہ کا بستر گول کیا تھا تو رفیق غزنوی مشہور موسیقار نے مفاہمت کی کوشش کی، اس نے ستارہ، اروڑہ اور نذیر کو اپنے یہاں بلایا۔ شراب کے دور چلے، رفیق نے جو گفتار کا غازی ہے بڑے فلسفیانہ انداز میں کئی پیگ شراب کے علاوہ پلائے۔ مگر کوئی صورت پیدا نہ ہوئی۔ اور جب کوئی صورت پیدا نہ ہوئی، تو خود بخود ایک صورت پیدا ہو گئی۔ رات بھر ستارہ رفیق کے فلیٹ میں رہی۔ اور وہ اس کو سمجھاتا رہا، کہ اب کوئی صورت پیدا نہیں ہو سکتی۔

عجیب بات ہے کہ رفیق نے پھر مفاہمت کی کوشش نہ کی۔ اور نہ ستارہ اس کے یہاں رات کو یہ سننے کے لئے گئی، کہ اب کوئی صورت پیدا نہیں ہو سکتی۔ شاید اس لئے کہ ستارہ کے کسی توڑے میں رفیق کو ایک دو ماتے کم محسوس ہوئے ہونگے اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ستارہ نے یہ محسوس کیا ہو کہ رفیق سُر سے ایک آدھ سُر تر اوپر

یا نیچے گا تا ہے ... اس کے متعلق وثوق سے کچھ نہیں کہا جا سکتا۔

اب ہم پھر ستارہ اور آصف کی طرف پلٹتے ہیں ستارہ اس پر بہت بری طرح لوٹھی کہ وہ نوجوان خاکسار تھا۔ اس کی زندگی میں ستارہ شاید سب سے پہلی عورت تھی ——

کہا جاتا ہے کہ نذیر نے ایک بار پھر چھاپہ مارا۔ اور دونوں کو عین موقعہ پر جا پکڑا۔ اس دفعہ کس نے بیچ بچاؤ کیا۔ آس کا مجھے علم نہیں۔

بہرحال معاملہ رفع دفع ہو گیا۔ کیونکہ آصف نے اپنے ماموں کو یقین دلا دیا، کہ اس کے اور ستارہ کے درمیان ایسی ویسی کوئی بات نہیں۔ بہرحال آصف اور ستارہ کے سر سے آئی بلا ایک دفعہ پھر ٹل گئی۔ مگر اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ایک دن آصف غائب ہو گیا۔ دوسرے دن معلوم ہوا، کہ ستارہ بھی غائب ہے۔ استفسار پر معلوم ہوا کہ وہ کسی تیرتھ کی یاترا کرنے گئی ہے۔ اگر موسم حج کا ہوتا، تو یار لوگ یقیناً اڑا دیتے، کہ حضرت آصف حج کرنے گئے ہیں۔

مجھے معلوم نہیں وہ دونوں کہاں گئے تھے۔ مگر دہلی سے خبر موصول ہوئی، کہ ستارہ مشرف بہ اسلام ہو چکی ہے۔ اور اس کا اسلامی نام اللہ رکھی رکھا گیا ہے۔ اور یہ کہ آصف نے اس سے باقاعدہ نکاح پڑھوا لیا ہے۔

اس کے ماموں نذیر پیاس کا کیا ردّ عمل ہوا۔ اس کے متعلق آپ خود سوچ سکتے ہیں۔ مگر پُر لطف بات یہ ہے کہ ہندوؤں کے قانون کے مطابق طلاق ہو ہی نہیں سکتی۔ عورت ایک مرتبہ کسی مرد سے وابستہ ہو جائے تو وہ سو حیلے کرنے پر بھی خود کو اپنے پتی سے جدا نہیں کر سکتی۔ یوں وہ آوارہ گردی کر سکتی ہے۔ سینکڑوں مردوں کی آغوش کی زینت بن سکتی ہے۔ مگر رہے گی اپنے پتی کی پتنی۔ اور یہ بھی ہے کہ ہندو عورت چاہے دوسرا مذہب اختیار کر لے۔ مگر اس کی اصل پوزیشن میں کوئی فرق نہیں آ سکتا۔

اس لحاظ سے گو ستارہ اندر کھی بن کر بیگم کے آصف ہوگئی تھی۔ مگر قانون کی نظروں میں وہ مسز ڈیسائی رہتی۔ اس بیمار صورت ڈیسائی کی بیوی، جو روٹی کمانے کے لئے بہت بُری طرح ہاتھ پاؤں مار رہا تھا۔

جب اس خبر کی تصدیق ہوگئی۔ تو میں نے مصور کے کالموں میں جی بھر کے لکھا۔ قریب قریب ہر ہفتے اس نئے بیاہتا جوڑے کا ذکر ہوتا تھا۔ بڑے طنزیہ، فرحیہ اور فکاہیہ انداز میں!

ماہ عسل یعنی ہنی مون منانے کے بعد جب یہ جوڑا بمبئی واپس آیا۔ تو نذیر خون کے گھونٹ پی کے رہ گیا۔ ایک دفعہ مجھے ریس کورس جانے کا اتفاق ہوا۔ میں نے دور سے دیکھا کہ ہجوم میں سے آصف شارک سکن کے بے داغ سوٹ میں ملبوس پھرتیلی ستارہ کی کمر میں ہاتھ دئے چلا آرہا ہے۔ جب وہ میرے قریب پہنچا، تو وہ پہلے مسکرایا۔ پھر ہنسنے لگا۔ اور میری طرف ہاتھ بڑھا کر کہنے لگا۔

"بھئی خوب۔ بہت خوب۔ نمک مرچ اور بال کی کھال کے کالموں میں تم جو لکھ رہے ہو۔ خدا کی قسم لاجواب ہے"

ستارہ تیوری چڑھا کر ایک طرف ہٹ گئی۔ مگر آصف نے اس طرف کوئی توجہ نہ کی۔ اور مجھ سے بڑے بلند بانگ خلوص کے ساتھ دیر تک باتیں کرتا رہا۔ میں اس سے پیشتر عرض کر چکا ہوں، کہ وہ بڑے ظرف کا آدمی ہے۔ اور ان پڑھ ہونے کے باوجود مزاح اور فکاہ سمجھنے کی اہلیت رکھتا ہے۔

اب بمبئی میں ہر شخص کو جسے فلمی صنعت سے دلچسپی تھی۔ معلوم ہو چکا تھا، کہ کوئی آصف ہے جس سے ستارہ نے شادی کر لی ہے۔ بھنڈی بازار اور محمد علی روڈ کے ایرانی ہوٹلوں میں پنجاب اور یو، پی کے مسلمان جو مسلم لیگ کی حمایت میں تھے۔ چائے کی پیالیاں سامنے رکھ کر اپنی بے پناہ مسرت کا اظہار کیا کرتے تھے۔ کہ میاں بھائی (مسلمان) نے ایک کافر

عورت کو مسلمان کر کے اپنے عقد میں لے لیا۔

بعض کہتے تھے کہ آصف کو اب اس سالی سے انگیجنگ نہیں کرانی چاہیے۔

بعض کہتے تھے کہ کوئی واندہ (حرج) نہیں۔ مگر جب باہر نکلے تو پردہ ضرور کیا کرے۔

بعض کہتے تھے ہٹاؤ یار، یہ سب اسٹنٹ ہے۔

بہرحال جہاں تک میں سمجھتا ہوں۔ آصف، ستارہ سے قانونی طور پر شادی کر چکا تھا۔ مگر ایک عرصے کے بعد جب میں نے اس سے پوچھا۔ "کیوں دھانسو، کیا واقعی ستارہ تمہاری منکوحہ بیوی ہے؟" تو وہ ہنسا اور بولا۔ "کیسا نکاح اور کیسی شادی؟"

اب اللہ ہی بہتر جانتا ہے کہ اصل معاملہ کیا تھا اور کیا ہے۔

آصف کا اپنا مکان کوئی بھی نہیں تھا۔ بس دونوں وہیں خداداد سرکل (دادر) میں رہتے تھے۔ اور کھلے بندوں رہتے تھے۔ ستارہ کی موٹر تھی، اسی میں دونوں گھومتے تھے۔

میرا خیال ہے دہلی میں آصف نے شاید لالہ جگت نرائن کو اس بات پر آمادہ کر لیا تھا، کہ وہ اسے ایک فلم بنانے کا سرمایہ دے۔ اس سے شاید اس نے کچھ ایڈوانس بھی لیا ہوگا۔ جبھی تو وہ تنگ دست نہیں تھا۔

آصف میں ایک بہت بڑی خوبی ہے کہ وہ خود اعتماد ہے۔ اس کے اندر احساس کمتری کا شائبہ تک موجود نہیں۔ وہ بڑے بڑے ڈائرکٹروں اور اسٹوری رائٹروں کے چھکے چھڑا دیتا ہے، محض اپنی خداداد قابلیت کی بدولت —— اس خداداد قابلیت کو میں "ہاؤس سنس" کہا کرتا تھا۔ آصف کے سامنے بھی۔ مگر اس نے کبھی برا نہ مانا۔

آصف جب ڈائرکٹر بنا تو دوسرے تنگ خیال اور کم ظرف ڈائرکٹروں کے مانند اس نے اپنا حلقۂ فکر و نظر محدود نہ رکھا۔ اس نے ہر دماغ کو دعوت دی، کہ وہ کوئی اچھی چیز پیش کرے۔ جسے وہ بخوشی قبول کرے گا۔

میں، خدا معلوم کہاں کا کہاں چلا گیا ہوں۔ مگر یہاں مجھے ایک لطیفے کا ذکر کرنا اس لئے دلچسپ معلوم ہوتا ہے۔ کہ میری ذات سے متعلق ہے۔

آصف ان دنوں "پھول" بنا رہا تھا۔ میں اپنے فلیٹ واقع کلیئر روڈ میں تھا کہ نیچے سے موٹر کے ہارن کی تابڑ توڑ آوازیں آئیں۔ میں نے باہر بالکنی میں نکل کر دیکھا ایک بہت بڑی موٹر نیچے کھڑی تھی۔ جب میں جنگلے پر جھکا تو پچھلی سیٹ سے آصف نے کھڑکی میں سے اپنا وزنی سر باہر نکالا۔ اور مسکرایا۔ میں نے اس سے کہا ——

"آؤ، کیا بات ہے؟"

اس نے دروازہ کھولا۔ اور پچھلی سیٹ پر بیٹھی ستارہ سے کچھ کہا۔ اس کے بعد مجھ سے مخاطب ہو کر بولا۔

"آتا ہوں۔ اور بتاتا ہوں"

لمبی چوڑی موٹر کا انجن سٹارٹ ہوا۔ اور وہ چشم زدن میں اڈلفی چیمبرز کے احاطے سے باہر نکل گئی۔ آصف نے سیڑھیوں کا رُخ کیا۔

میں نے دروازہ کھول دیا۔ ایک منٹ میں آصف اندر داخل ہوا۔ اور بڑے پُرجوش انداز میں مجھ سے ہاتھ ملا کر کہنے لگا۔" میں تمہیں اپنی ایک کہانی سُنانے آیا ہوں"

میں نے ازراہِ مذاق کہا" تمہیں معلوم ہے میں فیس لیا کرتا ہوں"

آصف نے کچھ نہ کہا۔ مجھ سے ہاتھ ملایا۔ اور الٹے پاؤں واپس چلا گیا۔ میں نے اس کو آوازیں دیں۔ اس کے پیچھے دوڑتا گیا۔ مگر اس نے میری ایک نہ سُنی۔

بس اتنا کہا کہ وہ قیس لے کر آئے گا تو کہانی سنائے گا۔ ورنہ نہیں۔

میں بہت پشیمان ہوا کہ میں نے اس سے ایسا مذاق کیوں کیا ـــــ میں سمجھتا تھا کہ وہ میری اس بات کو اُسی رنگ میں لے گا۔ جس رنگ میں وہ کہی گئی تھی۔ مگر معاملہ اس کے برعکس نکلا اور وہ چلا گیا۔

میں اوپر آیا۔ اور اپنی بیوی سے سارا قصہ بیان کیا تو اس نے صاف لفظوں میں کہا، کہ یہ میری عین حماقت تھی۔ اس لئے کہ آصف میرا بے تکلّف دوست نہیں تھا۔ اور یہ واقعہ ہے کہ اس کے اور میرے مراسم کچھ زیادہ نہیں تھے۔ چونکہ وہ اور میں طبعاً صاف گو، دل شکن حد تک صاف گو ہیں۔ اس لئے میں نے جب اس سے قیس کا مذاق کیا تھا، تو میرے دل و دماغ میں کوئی ایسی بات نہیں تھی۔ جس سے مجھے اس کے جذبات مجروح کرنا مطلوب تھے۔ اور نہ میں ایسا بنیا ہوں، کہ اس سے پہلے ہی روپے کا تقاضا کرتا ـــــ مجھے تو صرف کہانی سننا تھی، اور بس!

اور میں کئی ڈائرکٹروں سے ان کی بھرڈ کلاس کہانیاں ایک نہیں، چار چار مرتبہ سن چکا تھا۔ کیونکہ وہ میری رائے کے طالب ہوتے تھے۔ میں نے ان سے کبھی اپنے وقت کی، جو کہ ظاہر ہے ضائع ہوتا تھا۔ قیمت طلب نہیں کی تھی۔

مجھے افسوس تھا کہ میں نے آصف کو ناراض کیا۔ میں اس کے متعلق سوچ ہی رہا تھا، کہ دروازے پہ دستک ہوئی۔ میں نے دروازہ کھولا۔ ایک آدمی کھڑا تھا۔ اس نے ایک لفافہ میرے ہاتھ میں دیا۔ اور چلا گیا۔ میں ابھی لفافہ کھول ہی رہا تھا کہ نیچے سے ہارن کی آواز آئی۔ میں نے بالکنی میں جا کر دیکھا۔ ستارہ کی کار تھی۔ اور وہ اڈلفی چیمبرز کے گیٹ سے باہر نکل رہی تھی۔

لفافہ کھول کر میں نے دیکھا کہ سو سو کے پانچ نوٹ ہیں۔ ان کے ساتھ ایک مختصر سی

تحریر تھی۔

"فیس حاضر ہے۔ اب میں کل آؤں گا۔"

میں بھونچکا ہو کے رہ گیا۔

دوسرے روز صبح ۹ بجے کے قریب وہ اسی کار میں آیا۔ ستارہ ساتھ تھی۔ مگر وہ اوپر نہ آئی۔

آصف کو دستک دینے کی ضرورت محسوس نہ ہوئی۔ اس لئے کہ دروازہ کھلا تھا۔ اور میں استقبال کے لئے دہلیز میں کھڑا تھا۔

اس نے مجھے دیکھتے ہی کہا۔ "کیوں ڈاکٹر صاحب، فیس مل گئی آپ کو؟"

میں بہت شرمندہ ہوا جس کا اظہار میں نے بڑے پُرخلوص اور موزوں مناسب الفاظ میں کیا۔ اور وہ پانچ سو اس کو واپس کرنا چاہے۔

آصف اپنے مخصوص انداز میں ہنسا اور صوفے پر اپنی نشست جما کر کہنے لگا۔

"منٹو صاحب آپ کس خیال میں ہیں۔ یہ پیسہ میرا ہے نہ میرے باپ کا —— پروڈیوسر کا ہے۔ غلطی میری تھی، جو میں بغیر فیس کے چلا آیا۔ حالانکہ میری نیت واللہ ہرگز یہ نہیں تھی، کہ مفتوں مفتی کام کرایا جائے۔ آپ کا وقت یقیناً ضائع ہوگا۔ اور اس کی قیمت بھی خدا کی قسم آپ کو ضرور ملنی چاہیئے۔ لیکن اب چھوڑیئے اس بکواس کو۔ اور کہانی سنئے۔"

اس نے مجھے کچھ اور کہنے کی مہلت نہ دی۔ وہ بڑے صوفے پر تھا۔ میں اس کے سامنے ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔

آصف کو میں نے کبھی کہانی سناتے یا سنتے نہیں دیکھا تھا۔ اس نے اپنی بوسکی کی قمیض کی آستینیں اوپر چڑھائیں۔ پتلون کے اوپر کے بٹن جو پیٹی کا کام دیتے ہیں کھولے۔ اور صوفے پر ایک آسن جما کر کہانی سنانے کے انداز میں بیٹھ گیا۔

"ہاں تو کہانی سنئے ـــــ عنوان ہے "پھول" ـــــ کیا خیال ہے آپ کا عنوان کے متعلق ؟"

- میں نے کہا۔ "اچھا ہے"

"شکریہ! ـــــ اب آپ سُنئے ـــــ میں آپ کو منظر بہ منظر سُناتا ہوں"

اور اس نے اپنی کہانی جو خدا معلوم کس کی لکھی تھی۔ اپنے مخصوص انداز میں سُنانا شروع کی۔ یہ مخصوص انداز کچھ اس قسم کا ہے کہ کہانی سُنانے کے دوران میں وہ مداری پن کرتا ہے یعنی حسب ضرورت واقعات کے اتار چڑھاؤ کے ساتھ خود بھی اُتر تا چڑھتا رہتا ہے۔ ابھی وہ صوفے پر ہے۔ چند لمحے کے بعد اس کی پشت کی دیوار پر۔ دوسرے لمحے اس کا سر نیچے ہے اور ٹانگیں اوپر۔ اور دھم سے نیچے فرش پر۔ اس کے فوراً بعد کرسی پر اُکڑوں بیٹھا ہے۔ مگر فوراً اُٹھ کھڑا ہوا ہے۔ اور یوں معلوم ہوتا ہے کہ الیکشن میں کوئی آدمی ووٹ حاصل کرنے کے لئے تقریر کر رہا ہے۔

کہانی ختم ہوئی ـــــ بڑی لمبی کہانی۔ شیطان کی آنت کی طرح۔

چند لمحات خاموشی میں گذرے۔ اس کے بعد آصف نے مجھ سے پوچھا "کیا خیال ہے آپ کا، کہانی کے متعلق ؟"

میرے منہ سے یہ الفاظ خود بخود نکل گئے۔ "بکواس ہے!"

آصف نے زور زور سے اپنے ہونٹ کاٹے۔ اور بوکھلا کر صوفے کی پُشت کی دیوار پر بیٹھ گیا۔ اور غضبناک لہجے میں پوچھا۔ "کیا کہا ؟"

کوئی اور ہوتا، تو بہت ممکن ہے لڑ کھڑا جاتا۔ مگر میں ہمیشہ ایسے معاملوں میں ثابت قدم رہا ہوں۔ چنانچہ میں نے اور زیادہ مضبوطی سے کہا۔ "میں نے کہا تھا۔ بکواس ہے"

آصف نے اپنے مداری پن سے مجھے متاثر کرنے کی بہت کوشش کی۔ مجھے فضول کی جھک جھک پسند نہیں تھی۔ وہ بہت اونچے سروں میں بولتا تھا۔ میں نے سوچا، اس کا عِلاج یہی ہے، کہ ایک دفعہ میں بھی اپنے حلق کو کھلی چھٹی دے دوں۔ چنانچہ میں نے اس سے کہا۔

"سنئے آصف صاحب! آپ ایک بہت وزنی پتھر منگوا لیجئے۔ اس کو میرے سر پر رکھئے۔ اور اس پر وزنی ہتھوڑے ماریئے۔ خدا کی قسم میں پھر بھی کہوں گا، کہ آپ کی یہ کہانی بکواس ہے۔"

یہ سب کچھ میں نے بہت اونچے سروں میں کہا تھا۔ آصف صوفے کی پشت کی دیوار پر سے نیچے اُتر آیا۔ آگے بڑھ کر اس نے میرا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ اور اپنے ہونٹ چوستے ہوئے کہا۔ "خدا کی قسم، بالکل بکواس ہے۔ میں نے تم سے یہی سننے آیا تھا۔"

میں سمجھا، شاید مذاق کر رہا ہے۔ لیکن چند لمحات کے بعد مجھے معلوم ہو گیا کہ وہ قطعاً سنجیدہ تھا۔ چنانچہ ہم کہانی میں ترمیم و اصلاح کے متعلق سوچنے لگے۔

لطیفہ ختم ہوا۔ یہ میری ذات سے یقیناً متعلق ہے۔ مگر اس کے بیان سے مقصود صرف یہ تھا، کہ آپ کو آصف اور ستارہ کے کردار کا تقابل نظر آ جائے۔

ایک زمانہ گذر گیا۔ آصف اور ستارہ میاں بیوی کی زندگی گذار رہے تھے مگر یہاں مجھے ایک اور لطیفہ یاد آ گیا۔

جس زمانے میں آصف سے میری دوستی نہیں تھی۔ اور اس کا تعلق بھی ستارہ کے ساتھ قائم نہیں ہوا تھا۔

کے آصف صاحب کے چہرے پر بلا مبالغہ دس ہزار کیلیں تھیں اور اتنے ہی مہاسے تھے۔ جن کے متعلق کہا جاتا ہے کہ یہ جوانی کی نشانیاں ہیں۔ میں سوچتا

تھا۔ اگر جوانی کی نشانیاں اتنی بدنما اور تکلیف دہ ہوں۔ تو خدا کرے کسی پر جوانی نہ آئے (مجھ پر اللہ کا شکر ہے کبھی آئی ہی نہیں)

میں جب اس کے چہرے کی طرف دیکھتا، جو کہ بلا مبالغہ خانۂ زنبور دکھائی دیتا تھا، تو مجھے بڑی کوفت ہوتی۔ میں نیم حکیم بھی ہوں۔ اپنی دانست کے مطابق اور اپنے ڈاکٹر دوستوں سے مشورہ کر کے میں نے کئی دوائیں خرید کر اس کو دیں۔ مگر کوئی فائدہ نہ ہوا کیلیں اسی طرح موجود تھیں۔ مگر جب ستارہ اس کی زندگی میں آئی، تو چند مہینوں کے اندر اندر اس کا چہرہ بالکل صاف ہو گیا۔ صرف نشان باقی رہ گئے تھے۔

ایک اور لطیفہ سن لیجئے۔ بمبئی ٹاکیز میں کمال امروہوی اور میں دونوں اکٹھے کام کر رہے تھے۔ اس کی کہانی "محل" کو فلم کے لئے موزوں و مناسب شکل دینے کے لئے سوچ بچار ہو رہی تھی۔ اس دوران میں کمال کے داہنے گال پر ایک چھوٹی سی پھنسی نمودار ہوئی۔ جو اس کو بہت تکلیف دینے لگی۔ اس نے اس تکلیف کا ذکر مجھ سے کیا میں نے اس سے کہا۔ "ایک بڑا سہل علاج ہے اور تیر بہدف!"

اس نے مجھ سے پوچھا۔ "کیا؟"

میں نے اس سے کہا۔ "تم ستارہ کا گھر جانتے ہو نا؟"

"ہاں ہاں، کیوں نہیں؟"

"تو ایسا کرو۔ اس کی سیڑھیوں کا ایک چکر لگا آؤ۔ مگر دیکھو اندر نہیں جانا"

کمال ذہین آدمی ہے۔ میرا مطلب سمجھ گیا۔ اور بہت دیر تک ہنستا رہا۔

لطیفے ختم ہوئے۔

بہت دیر تک ستارہ اور آصف اکٹھے ازدواجی زندگی بسر کرتے رہے۔ اب دونوں غالباً ماہم کے ایک فلیٹ پر رہتے تھے۔ ہاں وہیں رہتے تھے۔ کیونکہ وہاں کئی مرتبہ میرا آنا جانا ہوا۔ لیڈی جمشید جی روڈ کے چرچ کے سامنے ایک گلی تھی۔

جس کے آخری سرے پہ ایک تین منزلہ بلڈنگ ـــــ غالباً تیسری منزل پر ستارہ کا فلیٹ تھا۔

مجھے یہاں جانے کا کئی بار اتفاق ہوا ـــــ ان دنوں آصف "پھول" بنانے کے بعد غالباً "انارکلی" بنانے کی تیاری کر رہا تھا۔ اس کی کہانی کمال امروہوی نے لکھی تھی۔ مگر وہ شاید اس سے مطمئن نہیں تھا۔ کیونکہ وہ کئی آدمیوں کو دعوت دے چکا تھا۔ کہ وہ اس میں کچھ جدت پیدا کریں۔ میں بھی اُن ہی لوگوں میں سے ایک تھا۔

میں عام طور پر صبح آٹھ بجے کے قریب وہاں پہنچتا۔ دروازہ ایک بڑھیا کھولتی۔ جو ململ کی باریک ساڑھی پہنے ہوتی۔ اسے دیکھ کر مجھے سخت کوفت ہوتی۔ مجھے ایسا معلوم ہوتا، کہ دروازہ الف لیلیٰ کی کسی کٹنی نے کھولا ہے۔

میں اندر جاتا اور صوفے پہ بیٹھ جاتا۔ ساتھ والے کمرے سے جو غالباً خواب گاہ تھی۔ ایسی ایسی آوازیں آتیں کہ روح لرز لرز جاتی۔ تھوڑی دیر بعد آصف نمودار ہوتا حسب عادت اپنے ہونٹ چاٹتے ہوئے۔ اس کی ہیئت کذائی دیکھنے کی چیز تھی۔ ململ کا کرتہ جگہ جگہ سے پھٹا ہوا ہے۔ گردن اور سینے پر نیل پڑے ہیں۔ بال پریشان ہیں سانس پھولی ہوئی ہے۔ معمولی علیک سلیک ہوتی۔ اور وہ فرش پر ڈھیر ہو جاتا۔ تھوڑی دیر کے بعد ستارہ آصف کے لئے ایک پیالہ بھیجتی۔ جس میں معلوم نہیں کس چیز کی کھیر ہوتی۔ آصف آہستہ آہستہ بادلِ ناخواستہ پیالہ ختم کرتا۔ اس کے بعد ہم اپنا کام شروع کر دیتے۔ جو زیادہ تر گپوں پر مشتمل ہوتا۔

کافی عرصہ گذر گیا۔ ستارہ اور آصف کے تعلقات بڑے مستحکم نظر آتے تھے۔ مگر ایکدم جانے کیا ہوا، کہ یہ سننے میں آیا، کہ آصف اپنے عزیزوں میں کسی لڑکی سے شادی کر رہا ہے۔ تاریخ پکی ہو گئی۔ اور وہ عنقریب اپنے دوستوں کے ساتھ

لاہور روانہ ہونے والا ہے۔

میں ان دنوں بہت مصروف تھا۔ ورنہ اس سے مل کر ضرور دریافت کرتا۔ کہ یہ کیا قصّہ ہے۔ لیکن مجھے اس کا موقعہ نہ ملا۔ لیکن ایک روز اس سے سرِ راہ ملاقات ہو گئی۔ میں نے سرسری طور پر اس سے پوچھا، تو اس نے صرف اتنا کہا۔ "میں نے وہ قصّہ ختم کرنے کی ٹھانی تھی۔ چنانچہ ہو جائے گا"

وہ کار میں تھا۔ میں پیدل تھا۔ اور اس کو عجلت بھی تھی۔ اس لئے زیادہ باتیں نہ ہو سکیں۔ چند روز کے بعد معلوم ہوا، کہ آصف ایک بہت بڑی پارٹی کے ساتھ روانہ ہو گیا ہے۔ اس کے بعد یہ اطلاع ملی کہ لاہور میں اس کی شادی بڑے ٹھاٹ سے ہوئی۔ خم کے خم لنڈھائے گئے۔ مجرے ہوئے اور راگ رنگ کی کئی محفلیں جمیں۔ پھر سنا کہ آصف اپنی نئی نویلی دلہن کے ساتھ بمبئی پہنچ چکا ہے۔ اور پالی ہل باندرہ میں اس نے ایک کوٹھی کا نصف حصّہ کرائے پر اُٹھا لیا ہے۔ لیکن بعد میں معلوم ہوا، کہ پوری کوٹھی نذیر کے پاس تھی جس نے آدھی اپنے بھانجے کو دے دی۔

یہ بڑا خوشگوار انقلاب تھا۔ مجھے معلوم نہیں ستارہ کا ردّعمل کیا تھا۔ لیکن میں اتنا جانتا ہوں کہ اروڑہ کے ہاں وہ اکثر جایا کرتی تھی۔ اور وہ بھی اس کے ہاں اکثر آیا کرتا تھا۔

ان دنوں آصف پالی ہل پر رہتا تھا۔ نئی نویلی دلہن پاس تھی۔ میرا خیال ہے، کہ وہ ان دنوں مغلِ اعظم کی تیاریوں میں مصروف تھا۔ اس کی کہانی کمال حیدر امروہوی نے لکھی تھی۔ مگر آصف اس سے مطمئن نہیں تھا۔ اس نے کئی انشا پرداز وں سے مشورہ لیا تھا۔ مگر وہ پھر بھی مطمئن نہ تھا۔

اس ضمن میں آپ کو کئی لطیفے سُنا سکتا ہوں۔ مگر اُن سے کوئی مطلب حل نہیں ہو گا۔ کہنا صرف یہ ہے کہ آصف اور اس کی نئی نویلی بیوی — سہرے جلوؤں کی بیاہی

چند روز اکٹھے رہے۔ اس کے بعد یہ دیکھنے میں آیا کہ آصف صاحب گھر سے غائب ہیں اور راتیں ستارہ کے ساتھ گذارتے ہیں۔

یہ شادی زیادہ دیر تک قائم نہ رہی۔ نذیر کا نوجوان لڑکا بھی وہیں تھا۔ معلوم نہیں، کیا ہوا، کہ آصف نے اپنی بیوی کے پاس جانا چھوڑ دیا۔ ناچاقی ہوئی۔ اس کے بعد پتہ چلا کہ طلاق ہونے والی ہے۔ اور اس دوران میں آصف برابر ستارہ کے یہاں جاتا رہا۔

اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ ستارہ کا رنگ ہے۔ اس کا مقابلہ نئی نویلی دلہن نہیں کر سکتی۔ چنانچہ چند مہینوں کے بعد آصف کی دلہن اپنے گھر واپس چلی گئی۔ اور بعد میں معلوم ہوا کہ طلاق ہو گئی ہے۔

اب پھر آصف اور ستارہ اکٹھے تھے۔ آصف کی بیاہتا بیوی کے متعلق کئی افسانے مشہور ہیں۔ مگر میں ان کا ذکر نہیں کرنا چاہتا۔ اس لئے کہ مجھے ان کی صداقت کے متعلق اچھی طرح علم نہیں۔

میں صرف اتنا جانتا ہوں کہ آصف نے بیاہ کیا۔ لاہور میں بڑے ٹھاٹ کی مجلسیں جمیں۔ اس کے بعد آصف اپنی بیوی کو لے کر بمبئی آیا۔ پالی ہل پر ٹھہرا۔ اور دو تین دن کے اندر اندر اس نے اپنی بیوی کو چھوڑ دیا۔ اس کی وجہ ستارہ کے سوا اور کیا ہو سکتی تھی۔

ستارہ مردم شناس عورت ہے۔ اس کو وہ تمام ڈھب آتے ہیں، جو مرد کو اپنی طرف راغب کر سکتے ہیں۔ مگر یوں کہئے کہ اسے دوسری عورتوں کے لئے بالکل ناکارہ بنا دیتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ آصف نے اپنی بیوی کو چھوڑ دیا۔ اور ستارہ کی آغوش میں چلا گیا۔ اس لئے کہ اس میں کشش تھی۔

آصف کی شادی اپنے خاندان میں ہوئی تھی۔ اس خاندان کے متعلق مختلف

روایات مشہور ہیں۔ لیکن میں ان کا تذکرہ کرنا نہیں چاہتا۔

آصف نے اپنی بیاہتا بیوی کو چھوڑ دیا۔ شاید اس لئے، کہ اس میں وہ خصوصیتیں موجود نہیں تھیں، جو ستارہ میں تھیں۔ شاید اس لئے کہ آصف کنواری لڑکی کا قائل نہیں تھا۔ بہرحال جو نتیجہ برآمد ہوا، وہ ہر شخص کو معلوم ہے۔

آصف کی نئی نویلی دلہن چلی گئی۔ اور آصف نے پھر سے ستارہ کے یہاں قیام شروع کر دیا۔ اس قیام کے دوران میں عجیب و غریب افواہیں منتشر ہو گئیں۔ مگر میں ان کے متعلق کچھ کہنا نہیں چاہتا۔

میں نے یہ مضمون لکھا ہے۔ مجھے معلوم ہے کہ آصف مجھ سے ناراض نہیں ہو گا۔ اس لئے کہ وہ بڑے ظرف کا آدمی ہے۔ ستارہ یقیناً ناراض ہو گی ـــــ مگر وہ مجھے تھوڑی دیر کے بعد بخش دے گی۔ اس لئے کہ اس کا ظرف بھی چھوٹا نہیں ہے۔ وہ بڑی قدآور عورت ہے۔ (حالانکہ اس کا قد بہت پست ہے) ـــــ وہ مجھے، معلوم نہیں کیسا آدمی سمجھتی ہے۔ مگر میں اسے بحیثیت عورت کے ایسی عورت سمجھتا ہوں، جو سو سال میں شاید ایک مرتبہ پیدا ہوتی ہے۔

# بی بی کی بے بی

عرصہ ہوا۔ نواب چھتاری کی صاحب زادی تسنیم (مسز تسنیم سلیم) نے مجھے ایک خط لکھا تھا :-

"کیا خیال ہے آپ کا اپنے بہنوئی کے متعلق؟ وہ جو اندانہ آپ کی طرف سے لگا کر لوٹے ہیں۔ تو مجھے اپنے لئے شادی مرگ کا اندیشہ ہوا جاتا ہے۔ اب میں آپ کو تفصیل سے بتا دوں کہ یہ حضرت مجھے آپ کے نام سے چھیڑا کرتے تھے۔ اور اُن کا خیال تھا کہ جب وہ میرے نادیدہ بھائی سے ملیں گے، تو نہ جانے کیا کیا حماقتیں سرزد ہوں گی .... اور مجھے شرمندگی ہو گی۔ اور اب پرسوں سے مُصر ہیں کہ بمبئی چل کر منٹو سے ملو۔ بہت ہی دلچسپ آدمی ہیں" اور اس طرح کہتے ہیں۔ گویا منٹو میرے بجائے ان کا بھائی ہے۔ اور میں ہمیشہ سے کہتی تھی کہ دیکھنا یہ حضرت کیسے نکلتے ہیں .... زبردستی تو ملاحظہ کیجئے .... بہر حال بہت خوش ہیں کہ میرا انتخاب بہت خوب رہا .... ہمارے برادر محترم یعنی ابن بھائی

سلیم سے قبل ہی پہنچ گئے تھے۔ اور انھوں نے سب سے
قبل یہی بات بتائی کہ وہ آپ سے نیاز حاصل کر کے آئے
ہیں۔ نرگس کا ذکر عمداً گول کر کے باقی سب تفصیل سے
بتا دیا۔ پھر جب سلیم آئے تو انھوں نے نہ صرف داستان جبتائی
بتائی۔ بلکہ آپ کی اور تخشت کی جنگ کا واقعہ بھی دلچسپی سے
بیان کیا۔ اس سلسلے میں سلیم معافی خواہ ہیں۔ وہ بارہ
جدّن بائی کے یہاں جانے کے محرّک شمشاد بھائی (جو آپ
سے مل چکے ہیں) وغیرہ تھے۔ اور اُن سے ممکن ہوتا۔ تو
آپ سے علاوہ نہ جاتے۔ اور یہ تو آپ بھی جانتے ہیں۔
کہ سلیم کو اگر عشق ہُوا ہے تو لیلا چٹنس سے ورنہ ایسے
بد نظر بھی نہیں۔

میں بہت مصروف تھا۔ جب سلیم میرے یہاں آئے۔ ان سے میری پہلی
ملاقات تھی۔ اور بقول تسنیم کے وہ میرے بہنوئی تھے۔ اس لئے ان کی خاطر داری
کے سوا اور کوئی چارہ نہیں تھا۔ گھر میں جو حاضر تھا ان کو ان کے مصاحبوں کی
خدمت میں پیش کر دیا۔ فلم سے متعلق لوگوں کے پاس ایک تحفے کی "شوٹنگ"
ہوتی ہے چنانچہ وہ بھی ان کو شری ساؤنڈ اسٹڈیو میں دکھا دی گئی۔ غالباً "بھول"
کی تھی جسے ڈائرکٹر دھانسو یعنی آصف بنا رہا تھا۔

سلیم اور اُن کے ساتھیوں کو بظاہر مطمئن ہو جانا چاہیئے تھا۔ مگر ایسا معلوم
ہوتا ہے کہ وہ اپنا پروگرام بنا کر بمبے پہنچے تھے۔ سلیم نے بر سبیلِ تذکرہ مجھ سے پوچھا
"کیوں صاحب، نرگس کہاں ہوتی ہے آج کل؟"
میں نے ازراہِ مذاق کہا "اپنی ماں کے پاس"

میرا مذاق غیر طبعی موت کی گود میں چلا گیا۔ جب میرے مہمانوں میں سے ایک نے بڑی نوّابانہ سادہ لوحی سے کہا "جدّن بائی کے پاس؟"

"جی ہاں"

سلیم نے پوچھا "کیا اس سے ملاقات ہو سکتی ہے ـــــ میرا یہ مطلب ہے کہ میرے یہ دوست اس کو دیکھنے کے بہت مشتاق ہیں ..... کیا آپ اس کو جانتے ہیں؟"

میں نے جواب دیا "جانتا ہوں ..... مگر معمولی سا"

ایک صاحب نے بڑے بے ڈھب انداز میں سوال کیا۔ "کیوں؟"

اس لئے کہ اُسے اور مجھے ابھی تک کسی فلم میں اکٹھے کام کرنے کا موقعہ نہیں ملا"

سلیم نے یہ سن کر کہا "تو چھوڑیئے ـــ ہم آپ کو خواہ مخواہ تکلیف دینا نہیں چاہتے!!"

لیکن میں خود نرگس کے ہاں جانا چاہتا تھا۔ کئی دفعہ ارادہ کیا تھا۔ مگر اکیلا جانا مجھے پسند نہیں تھا۔ ساتھ ملتا تو تھا نہایت بے ہودہ۔ یعنی دیدے پھاڑ پھاڑ کر گھورنے والا۔ اب موقعہ تھا آدمی سادہ لوح تھے۔ محض عیّاشی کے طور پر نرگس کو ایک نظر دیکھنا چاہتے تھے تاکہ واپس اپنی جاگیروں اور ریاستوں میں جاکر اپنے دوستوں اور مصاحبوں کو مشہور فلم اسٹار نرگس کے چشم دیدہ حالات سنائیں۔ چنانچہ میں نے سلیم سے کہا "تکلیف کی کوئی بات نہیں۔ چلتے ہیں۔ ممکن ہے ملاقات ہو جائے۔"

میں نرگس سے کیوں ملنا چاہتا تھا۔ بمبے میں اتنی ایکٹرسیں تھیں جن کے ہاں میں جب چاہتا آجا سکتا تھا۔ مگر خاص طور پر نرگس سے ملنے کا مطلب کیا تھا؟ میرا خیال ہے۔ اس کا جواب دینے سے پہلے میں آپ کو دلچسپ واقعہ سناؤں۔

میں فلمستان میں ملازم تھا۔ صبح جاتا تو شام کے لوٹتا۔ ایک روز اتفاق سے واپسی جلدی ہوئی۔ یعنی میں دوپہر ہی کے قریب گھر پہنچ گیا۔ اندر داخل ہوا تو ساری فضا مرتعش نظر آئی۔ جیسے کوئی ساز کے تار چھیڑ کر خود چھپ گیا ہے ڈریسنگ ٹیبل کے پاس میری دو سالیاں کھڑی بظاہر اپنے بال گوندھ رہی تھیں مگر اُن کی انگلیاں ہوا میں چل رہی تھیں۔ ہونٹ دونوں کے پھڑپھڑا رہے تھے۔ مگر آواز نہیں نکلتی تھی۔ دونوں ہل جل کر گھبراہٹ کی ایسی تصویر پیش کر رہی تھیں جو اپنی گھبراہٹ چھپانے کی خاطر بے مطلب دوپٹہ اوڑھنے کی کوشش کر رہی ہو۔ ملحقہ کمرے کے دروازے کا پردہ اندر کی طرف دبا ہُوا تھا۔

میں صوفے پر بیٹھ گیا۔ دونوں بہنوں نے ایک دوسرے کی طرف قصور وار لگا ہوا سے دیکھا، ہولے ہولے سے کھسر پھسر کی۔ پھر دونوں نے بیک وقت کہا: "بھاجی سلام"

"وعلیکم السلام" میں نے غور سے اُن کی طرف دیکھا "کیا بات ہے؟"

میں نے سوچا کہ سب مل کر سینما جا رہی ہیں۔ دونوں نے میرا سوال سن کر پھر کھسر پھسر کی۔ پھر ایک دم کھلکھلا کر ہنسیں اور دوسرے کمرے میں بھاگ گئیں میں نے سوچا کہ شاید انھوں نے اپنی کسی سہیلی کو مدعو کیا ہے، وہ آنے والی ہے۔ اور چونکہ میں غیر متوقع طور پر جلد چلا آیا ہوں۔ اس لیئے ان کا پروگرام ناہم برہم ہو گیا ہے۔

دوسرے کمرے میں کچھ دیر تک تینوں بہنوں میں سرگوشیاں ہوتی رہی ہیں۔ دبی دبی ہنسی کی آوازیں بھی آتی رہیں۔ اس کے بعد سب سے بڑی بہن یعنی میری بیوی بظاہر اپنی بہنوں سے مخاطب، مگر دراصل مجھے سنانے کے لئے یہ کہتی ہوئی باہر نکلی۔ "مجھے کیا کہتی ہو۔ کہنا ہے تو خود اُن سے کہو —— سعادت صاحب آج بہت جلدی آ گئے؟"

میں نے وجہ بیان کر دی کہ اسٹڈیو میں کوئی کام نہیں تھا اس لئے چلا آیا۔
پھر اپنی بیوی سے پوچھا "کیا کہنا چاہتی ہیں میری سالیاں ؟"

"یہ کہنا چاہتی ہیں کہ نرگس آرہی ہے۔"

تو کیا ہُوا ــــ آئے۔ کیا وہ پہلے کبھی نہیں آئی۔"

میں سمجھا کہ وہ اُس پارسی لڑکی کی بات کر رہی ہے جس کی ماں نے ایک مسلمان سے شادی کر لی تھی اور ہمارے پڑوس میں رہتی تھی۔ مگر میری بیوی نے کہا "ہائے، وہ پہلے کب ہمارے ہاں آئی ہے۔"

"تو کیا وہ کوئی اور نرگس ہے؟"

"میں نرگس ایکٹرس کی بات کر رہی ہوں۔"

میں نے تعجب سے پوچھا " وہ کیا کرنے آرہی ہے یہاں ؟"

میری بیوی نے مجھے سارا قصّہ سنایا۔ گھر میں ٹیلیفون تھا۔ جسے تینوں بہنیں فرصت کے اوقات میں بڑی فراخدلی سے استعمال کرتی تھیں۔ جب اپنی سہیلیوں سے باتیں کرتی کرتی تھک جاتیں تو کسی ایکٹرس کا نمبر گھما دیتیں۔ وہ مل جاتی تو اُس سے اوٹ پٹانگ گفتگو شروع ہو جاتی ـــ ہم آپ کی بہت مدّاح ہیں۔ آج ہی دلّی سے آئی ہیں۔ بڑی مشکلوں سے آپ کا نمبر حاصل کیا ہے۔ آپ سے ملاقات کرنے کے لئے تڑپ رہی ہیں۔ ضرور حاضر ہوتیں مگر پردے کی پابندی ہے۔

آپ بہت حسین ہیں چندے آفتاب چندے ماہتاب۔ گلا ماشاءاللہ بہت ہی سریلا ہے (حالانکہ ان کو معلوم ہوتا تھا کہ اس میں امیر بائی بولتی ہے یا شمشاد)

عام طور پر مشہور فلم ایکٹرسوں کے ٹیلیفون نمبر ڈائریکٹری میں درج نہیں

ہوتے۔ وہ خود نہیں کرائیں کہ اُن کے چاہنے والے بیکار تنگ نہ کریں۔ مگر ان تین بہنوں نے میرے دوست آغا خلش کاشمیری کے ذریعے سے قریب قریب اُن تمام ایکٹرسوں کے فون نمبر معلوم کر لئے تھے۔ جو انھیں ڈائرکٹری میں نہیں ملے تھے۔

اس ٹیلیفونی شغل کے دوران میں جب انھوں نے نرگس کو بلایا اور اس سے بات چیت کی۔ تو بہت پسند آگئی۔ اس گفتگو میں ان کو اپنی عمر کی آواز سنائی دی۔ چنانچہ چند گفتگوؤں ہی میں وہ اس سے بے تکلف ہو گئیں۔ مگر اپنی اصلیت چھپائی رکھی۔ ایک کہتی میں افریقہ کی رہنے والی ہوں۔ وہی دوسری بار یہ بتاتی کہ لکھنؤ سے اپنی خالہ کے پاس آئی ہے۔ دوسری یہ ظاہر کرتی کہ وہ لاہ لینڈی کی رہنے والی ہے۔ اور صرف اس لئے بمبے آئی ہے۔ کہ اُسے نرگس کو ایک بار دیکھنا ہے تیسری، یعنی میری بیوی کبھی گجراتن بن جاتی کبھی پارسن۔

ٹیلیفون پر کئی بار نرگس نے جھنجھلا کر پوچھا کہ تم لوگ اصل میں کون ہو۔ کیوں اپنا نام چھپاتی ہو۔ صاف صاف کیوں نہیں بتاتیں کہ یہ روز روز کی ٹن ٹن ختم ہو۔

ظاہر ہے کہ نرگس ان سے متاثر تھی۔ اس کو یقیناً اپنے سینکڑوں مداحوں کے فون آتے ہوں گے۔ مگر یہ تین لڑکیاں ان سے کچھ مختلف تھیں اس لئے وہ سخت بے چین تھی کہ اُن کی اصلیت جانے اور اُن سے ملے جلے، چنانچہ جب بھی اُسے معلوم ہوتا کہ اُن پُر اسرار لڑکیوں نے اُسے بلایا ہے تو وہ سو کام چھوڑ کر آتی۔ اور بہت دیر تک ٹیلیفون کے ساتھ چپکی رہتی۔

ایک دن نرگس کے پیہم اصرار پر بالآخر طے ہو گیا کہ اُن کی ملاقات ہو کے رہے گی میری بیوی نے اپنے گھر کا پتہ [illegible] دیا۔ اور کہا کہ اگر پھر بھی مکان ملنے میں دقت ہو تو بائی کھلہ کے پل کے پاس کسی ہوٹل سے ٹیلیفون کر دیا جائے۔ وہ سب وہاں پہنچ جائیں گی۔

جب میں گھر میں داخل ہوا۔ بائی کھلہ پل کے ایک اسٹور سے نرگس نے فون کیا تھا کہ وہ پہنچ چکی ہے۔ مگر مکان نہیں مل رہا۔ چنانچہ تینوں افراتفری کے عالم میں تیار ہو رہی تھیں کہ میں بلائے ناگہانی کی طرح پہنچ گیا۔

چھوٹی دو کا خیال تھا کہ میں ناراض ہوں گا۔ بڑی یعنی میری بیوی محض بوکھلائی ہوئی تھی کہ یہ سب کیا ہوتا ہے ـــــ میں نے ناراض ہونے کی کوشش کی مگر مجھے اس کے لئے کوئی معقول جواز نہ ملا۔ سارا قصہ کافی دلچسپ اور بیحد معصوم تھا۔ اگر "کان مچولی" کی یہ حرکت صرف میری بیوی سے سرزد ہوئی ہوتی تو بالکل جدا بات تھی۔ ایک سالی آدھی گھر والی ہوتی ہے اور یہاں دو سالیاں تھیں۔ پورا گھر ہی ان کا تھا۔ میں جب اٹھا تو دوسرے کمرے میں خوش ہونے اور تالیاں بجانے کی آوازیں بلند ہوئیں۔

بائی کھلہ کے چوک میں جدن بائی کی لمبی چوڑی موٹر کھڑی تھی۔ میں نے سلام کیا تو اس نے حسب معمول بڑی بلند آواز میں اس کا جواب دیا اور پوچھا۔ "کہو منٹو کیسے ہو"

میں نے کہا "اللہ کا شکر ہے ـــــ کہئے آپ یہاں کیا کر رہی ہیں"

جدن بائی نے پچھلی نشست پہ بیٹھی ہوئی نرگس کی طرف دیکھا "کچھ نہیں بے بی کو اپنی سہیلیوں سے ملنا تھا۔ مگر ان کا مکان نہیں مل رہا"

میں نے مسکرا کر کہا "چلئے میں آپ کو لے چلوں"

نرگس یہ سن کر کھڑکی کے پاس آگئی "آپ کو ان کا مکان معلوم ہے؟"

میں نے اور زیادہ مسکرا کر کہا "کیوں نہیں ـــــ اپنا مکان کون بھول سکتا ہے"

جدن بائی کے حلق نے عجیب سی آواز نکالی۔ پان کے بیڑے کو دوسرے کلے میں تبدیل کرتے ہوئے کہا "یہ تم کیا افسانہ نگاری کر رہے ہو"

میں دروازہ کھول کر جدّن بائی کے پاس بیٹھ گیا "بی بی! یہ افسانہ نگاری میری نہیں ہے۔ میری بیوی اور اُس کی بہنوں کی ہے"۔ اس کے بعد میں نے مختصراً تمام واقعات بیان کر دیئے۔ نرگس بڑی دلچسپی سے سنتی رہی۔ جدّن بائی کو بہت کوفت ہوئی۔ "لاحول ولا..... یہ کیسی لڑکیاں ہیں۔ پہلے ہی دن کہہ دیا ہوتا کہ ہم منٹو کے گھر سے بول رہی ہیں.... خدا کی قسم میں فوراً بے بی کو بھیج دیتی۔ بھئی حد ہو گئی ہے اتنے دن پریشان کیا..... خدا کی قسم بے چاری بے بی کو اتنی الجھن ہوتی تھی کہ میں تم سے کیا کہوں۔ جب ٹیلی فون آتا۔ بھاگی بھاگی جاتی ____ میں ہزار پوچھتی یہ کون ہے جس سے اتنی دیر میٹھی میٹھی باتیں ہوتی ہیں۔ مجھ سے کہتی کوئی ہیں جانتی نہیں کون نہیں۔ مگر ہیں بڑی اچھی۔ دو ایک بار میں نے بھی ٹیلیفون اٹھایا۔ گفتگو ماشا اللہ بڑی شائستہ تھی۔ کسی اچھے گھر کی معلوم ہوتی تھیں۔ مگر معاف کرنا۔ کم بخت اپنا نام پتہ صاف بتاتی ہی نہیں تھیں۔ آج بے بی آئی۔ خوشی سے دیوانی ہو رہی تھی۔ کہنے لگی۔ بی بی! انھوں نے بلایا ہے۔ اپنا ایڈریس دے دیا ہے۔ میں نے کہا۔ پاگل ہوئی ہو تم۔ خدا جانے کون ہیں۔ کون نہیں۔ پر اس نے میری ایک نہ مانی۔ ایسی پیچھے پڑ گئی۔ چنانچہ مجھے ساتھ آنا ہی پڑا ____ خدا کی قسم اگر معلوم ہوتا کہ یہ آفتیں تمہارے گھر کی ہیں....."

میں نے بات کاٹ کر کہا "تو ساتھ آپ نازل نہ ہوتیں"۔

جدّن بائی کے گلے میں دبے ہوئے پان میں چوڑی مسکراہٹ پیدا ہوئی "اُس کی ضرورت ہی کیا تھی ____ میں کیا تمہیں جانتی نہیں"۔

مرحومہ کو اردو ادب سے بڑا شغف تھا۔ میری تحریریں بڑے شوق سے پڑھتی اور پسند کرتی تھیں۔ ان دنوں میرا ایک مضمون "ساقی" میں شائع ہوا تھا۔ غالباً "ترقی یافتہ قبرستان" معلوم نہیں اس کا ذہن کیوں اس طرف چلا گیا۔ "خدا کی

قسم منٹو ــ بہت خوب لکھتے ہو۔ ظالم کیا طنز کیا ہے اس مضمون میں۔ کیوں بے بی۔ اس دن کیا حال ہوا تھا میرا یہ مضمون پڑھ کر۔"

مگر نرگس اپنی نادیدہ سہیلیوں کے متعلق سوچ رہی تھی۔ اضطراب بھرے لہجے میں اس نے اپنی ماں سے کہا "چلو بی بی!"

جدن بائی مجھ سے مخاطب ہوئی "چلو بھائی!"

گھر پاس ہی تھا۔ موٹر اسٹارٹ ہوئی۔ اور ہم پہنچ گئے۔ اُوپر بالکنی سے تینوں بہنوں نے ہمیں دیکھا۔ چھوٹی نوکا مارے خوشی کا بُرا حال ہو رہا تھا۔ خدا معلوم آپس میں کیا کھسر پھسر کر رہی تھیں۔ جب ہم اُوپر پہنچے تو عجیب و غریب طریقے پر سب کی ملاقات ہوئی۔ نرگس اپنی ہم لڑکیوں کے ساتھ دوسرے کمرے میں چلی گئی۔ ادھر میں، میری بیوی اور جدن بائی وہیں بیٹھ گئے۔

بہت دیر تک مختلف زاویوں سے کان چھولی کے سلسلے پر تبصرہ کیا گیا۔ میری بیوی کی بوکھلاہٹ جب کسی قدر کم ہوئی تو اس نے میزبان کے فرائض سرانجام دینے شروع کر دیئے۔

میں اور جدن بائی فلم انڈسٹری کے حالات پر تبادلہ خیالات کرتے رہے۔ پان کھلانے کے معاملے میں بڑی خوش ذوق تھی۔ ہر وقت اپنی پندنیاں ساتھ رکھتی تھی۔ بڑی دیر کے بعد موقع ملا تھا۔ اس لئے میں نے اس پر خوب ہاتھ صاف کیا۔

نرگس کو میں نے ایک مدت کے بعد دیکھا تھا۔ دس گیارہ برس کی بچی تھی۔ جب میں نے ایک دو مرتبہ فلموں کی نمائش عظمیٰ میں اُسے اپنی ماں کی اُنگلی کے ساتھ لیٹی دیکھا تھا۔ چندھیائی ہوئی آنکھیں بے کشش سا لمبوترا چہرہ۔ سوکھی سوکھی ٹانگیں، ایسا معلوم ہوتا تھا۔ سو کے اُٹھی ہے یا سونے والی ہے۔ مگر اب وہ ایک جوان لڑکی تھی۔ عمر نے اُس کی خالی جگہیں پُر کر دی تھیں۔ مگر آنکھیں ویسی کی ویسی تھیں۔

چھوٹی اور خواب زدہ ـــــ بیمار بیمار ـــــ میں نے سوچا اس رعایت سے اس کا نام نرگس موزوں و مناسب ہے۔

طبیعت میں نہایت ہی معصوم کھلنڈرا پن تھا۔ بار بار اپنی ناک پونچھتی تھی جیسے ازلی زکام کی شکار ہے (برسات میں اس کو ادا کے طور پر پیش کیا گیا ہے) مگر اس کے اداس اداس چہرے سے صاف عیاں تھا۔ کہ وہ اپنے اندر کردار نگاری کا جوہر رکھتا ہے۔ ہونٹوں کو کسی قدر بھینچ کر بات کرنے اور مسکرانے میں گو بظاہر ایک بناوٹ تھی۔ مگر صاف پتہ چلتا تھا کہ یہ بناوٹ سنگار کا روپ اختیار کر کے رہے گی۔ آخر کردار نگاری کی بنیادیں بناوٹ ہی پر تو استوار ہوتی ہیں۔

ایک بات جو خاص طور پر میں نے محسوس کی وہ یہ ہے کہ نرگس کو اس بات کا کامل احساس تھا کہ وہ ایک دن بہت بڑی اسٹار بننے والی ہے۔ مگر یہ دن قریب تر لانے اور اُسے دیکھ کر خوش ہونے میں اسے کوئی عجلت نہیں تھی۔ اس کے علاوہ اپنے لڑکپن کی ننھی منی خوشیاں گھسیٹ کر بڑی بڑی بے ہنگم خوشیوں کے دائرے میں نہیں لے جانا چاہتی تھی۔

تینوں ہم عمر لڑکیاں دوسرے کمرے میں جو باتیں کر رہی تھیں۔ ان کا دائرہ گھر اور کنونٹ کی چار دیواری تک محدود تھا۔ فلم اسٹوڈیو میں کیا ہوتا ہے۔ رومانس کیا بلا ہے۔ اس سے ان کو کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ نرگس بھول گئی تھی کہ وہ فلم اسٹار ہے پردے پر جس کی ادائیں بکتی ہیں۔ اور اس کی سہیلیاں بھی یہ بھول گئی تھیں کہ نرگس اسکرین پر بڑی بڑی حرکتیں کرنے والی ایکٹرس ہے۔

میری بیوی جو عمر میں نرگس سے بڑی تھی۔ اب اس کی آمد پر بالکل بدل گئی تھی۔ اس کا سلوک اس سے ایسا ہی تھا۔ جیسا اپنی چھوٹی بہنوں سے تھا۔ پہلے اُس کو نرگس سے اس لئے دلچسپی تھی کہ فلم ایکٹرس ہے۔ پردے پر بڑی خوبی

سے نت نئے مردوں سے محبت کرتی ہے ہنستی ہے آہیں بھرتی ہے۔ کدکڑے لگاتی ہے۔ اب اسے خیال تھا کہ وہ کھٹی چیزیں نہ کھائے۔ بہت ٹھنڈا پانی نہ پیئے۔ زیادہ فلموں میں کام نہ کرے۔ اپنی صحت کا خیال رکھے۔ اب اس کے نزدیک نرگس کا فلموں میں کام کرنا کوئی معیوب بات نہیں تھی۔

میں، میری بیوی، اور جدن بائی اِدھر اُدھر کی باتوں میں مشغول تھے کہ آپا سعادت آگئیں۔ میری ہم نام ہیں اور بڑی دلچسپ چیز۔ تصنّع سے لاکھوں میل دور ہیں۔ حسبِ معمول وہ اس انداز سے آئیں کہ جدن بائی سے اُن کو متعارف کرانے کا ہمیں موقعہ ہی نہ ملا۔ اپنے دو ڈھائی من کے وجود کے بوجھ کو صوفے پہ ہلکے کرتے ہوئے بولیں "صفو جان! تمھارے بھائی جان سے میں نے لاکھ کہا تھا کہ ایسی مردار موٹر نہ خریدو۔ مگر انھوں نے ایک نہ سُنی ــــ دو قدم چلی ہو گی کہ ہانپنے لگی اور کھڑی ہو گئی۔ اب کھڑے ہینڈل مار رہے ہیں۔ میں نے کہا آپ چلیئے۔ میں تو صفو کے پاس بیٹھی ہوں۔

جدن بائی غالباً کسی نواب کی بات کر رہی تھیں جو بہت عیاش تھا۔ آپا سعادت کی وجہ سے یہ بات مکمل نہ ہو سکی تھی۔ جب پھر شروع ہوئی تو آپا سعادت نے بھی اس میں حصہ لینا شروع کر دیا۔ کاٹھیاواڑ کی قریب قریب تمام ریاستوں اور اُن کے نوابوں کو وہ اچھی طرح جانتی تھیں۔ کیونکہ ریاست مانگرول کے نوابی خاندان میں بیاہی گئی تھیں۔

جدن بائی اپنے پیشے کی وجہ سے تمام والیانِ ریاست کو اچھی طرح جانتی پہچانتی تھیں۔ باتوں باتوں میں ایک بڑی ریاست خور قسم کی طوائف کا ذکر چھڑ گیا۔ آپا سعادت شروع ہو گئیں "خدا ان سے محفوظ رکھے۔ جس کے ساتھ چمٹتی ہیں اس کو دین کا رکھتی ہیں نہ دنیا کا۔ دولت برباد، صحت برباد، عزت برباد، صفو جان

میں تمھیں کیا بتاؤں، سو بیماریوں کی ایک بیماری ہے یہ طوائف ——"

میں اور میری بیوی سخت پریشان کہ آپا سعادت کو کیسے روکیں۔ جدّن بائی بڑی فراخدلی سے آپا سعادت کی ہاں میں ہاں ملا رہی تھی اور ہم دونوں پسینہ پسینہ ہوئے جا رہے تھے۔ ایک دو بار میں نے اُن کو روکنے کی کوشش کی مگر وہ اور زیادہ جوش میں آگئیں۔ جی بھر کے گالیاں دینے لگیں، لیکن یک لخت انھوں نے جدّن بائی کی طرف دیکھا۔ ان کے سفید گوشت بھرے چہرے پر عجیب و غریب تھرتھری پیدا ہوئی۔ ان کی ناک کی کیل کا ہیرا گردن کی جنبش کے ساتھ دو تین دفعہ بڑی تیزی سے چمکا اور پھر اُن کا منہ کھلا۔ زور سے اپنی رانوں پر دو ہتڑ مار کر انھوں نے تتلائے ہوئے لہجے میں جدّن بائی سے کہا۔

"آپ؟..... آپ تو جدّن ..... آپ جدّن بائی ہیں نا؟"

جدّن بائی نے بڑی متانت سے جواب دیا۔ "جی ہاں!"

آپا سعادت کا منہ اور زیادہ کھلا ....." اوہ..... تو آپ..... میرا مطلب ہے کہ آپ تو بہت اُونچی طوائف ہیں..... کیوں صفّو جان؟" صفو جان برف ہو گئی۔ میں نے جدّن بائی کی طرف دیکھا اور مسکرایا —— میرا خیال ہے بہت ہی واہیات قسم کی مسکراہٹ تھی۔ جدن بائی نے یوں ظاہر کیا جیسے کوئی بات نہیں ہوئی اور اُس بڑی ریاست خورد قسم کی طوائف کے بقایا حالات بیان کرنے شروع کر دیئے جس کا ذکر چھیڑنے پر آپا سعادت کو پیچر دینا پڑا تھا۔

جدّن بائی کی کوشش کے باوجود بات نہ جمی۔ آپا سعادت کو اپنی غلطی کا اور ہمیں اپنی خفت کا بہت ہی شدید احساس تھا۔ مگر جب لڑکیاں آگئیں تو فضا کا تکدر دور ہو گیا۔ اِدھر اُدھر کی باتوں کے بعد نرگس سے فرمائش کی گئی کہ وہ گانا سنائے۔ اس پر جدّن بائی نے کہا۔ "میں نے اس کو موسیقی کی تعلیم نہیں دی

موہن بابو اس کے خلاف تھے اور سچ پوچھئے تو مجھے بھی پسند نہیں تھا ——
تھوڑا بہت ٹوں ٹاں کر لیتی ہے" اس کے بعد وہ اپنی بیٹی سے مخاطب ہوئی
"سنا دو بے بی..... جیسا بھی آتا ہے سنا دو"
نرگس نے بڑی ہی معصومانہ بے تکلفی سے گانا شروع کر دیا — پیپے دیجے
کی کن سُری تھی - آواز میں رس نہ لوچ ، میری چھوٹی سالی اس سے لاکھوں درجے
بہتر گاتی تھی - مگر فرمائش کی گئی تھی اور وہ بڑی پُراصرار' اس لئے دو تین منٹ
تک اس کا گانا برداشت کرنا ہی پڑا - جب اُس نے ختم کیا تو سب نے تعریف کی -
میں اور آپا سعادت خاموش رہے - تھوڑی دیر کے بعد جدّن بائی نے رخصت
چاہی - لڑکیاں نرگس سے گلے ملیں - دوبارہ ملنے کے وعدے وعید ہوئے - کچھ
کھسر پھسر بھی ہوئی اور ہمارے مہمان چلے گئے -
نرگس سے یہ میری پہلی ملاقات تھی -
اس کے بعد اور کئی ملاقاتیں ہوئیں - لڑکیاں ٹیلیفون کرتی تھیں اور نرگس
اکیلی موٹر میں چلی آتی تھی - اس آمد و رفت میں اس کے ایکٹرس ہونے کا احساس قریب
قریب مٹ گیا - وہ لڑکیوں سے اور لڑکیاں اس سے یوں ملتی تھیں جیسے وہ
ان کی بہت پرانی سہیلی ہے - یا کوئی رشتہ دار ہے - لیکن جب وہ چلی جاتی تو
کبھی کبھی تینوں بہنیں اس استعجاب کا اظہار کرتیں - خدا کی قسم عجیب بات ہے کہ
نرگس بالکل ایکٹرس معلوم نہیں ہوتی -
اس دوران میں تینوں بہنوں نے اس کا ایک تازہ فلم دیکھا جس میں ظاہر
ہے کہ وہ اپنے ہیرو کی محبوبہ تھی جس سے وہ پیار محبت کی باتیں کرتی تھی اور اُسے
عجیب عجیب نگاہوں سے دیکھتی تھی - اس کے ساتھ لگ کر کھڑی ہوتی تھی - اس
کا ہاتھ دباتی تھی - میری بیوی کہتی "کم بخت اُس کے فراق میں کیسی لمبی لمبی آہیں بھر

رہی تھی۔ جیسے سچ مچ اُس کے عشق میں گرفتار ہے" اور اُس کی چھوٹی دو بہنیں اپنے کنوارے ایکٹنگ سے ناآشنا دلوں میں سوچتیں "اور کل وہ ہم سے پوچھ رہی تھی کہ گڑ کی ٹوفی کیسے بنائی جاتی ہے۔"

نرگس کی اداکاری کے متعلق میرا خیال بالکل مختلف تھا۔ وہ قطعی طور پر جذبات و احساسات کی صحیح عکاسی نہیں کرتی تھی۔ محبت کی نبض کس طرح چلتی ہے یہ انا ڑی انگلیاں کیسے محسوس کر سکتی تھیں۔ عشق کی دوڑ میں تھک کر ہانپنا اور اسکول کی دوڑ میں تھک کر سانس کا پھول جانا وہ بالکل مختلف چیزیں ہیں۔ میرا خیال ہے کہ خود نرگس بھی اس کے فرق سے آگاہ نہیں تھی۔ اس کے شروع شروع کے فلموں میں چنانچہ دقیقہ رس نگاہیں فوراً معلوم کر سکتی ہیں کہ اس کی اداکاری یکسر فریب کاری سے معرّا بھی۔

تصنّع کا یہ کمال ہے کہ وہ تصنّع معلوم نہ ہو۔ لیکن نرگس کے تصنّع کی بنیادیں چونکہ تجربے پر استوار نہیں تھیں۔ اس لئے اس میں یہ خوبی نہیں تھی۔ یہ صرف اس کا خلوص تھا۔ وہ بے پناہ خلوص جو اسے اپنے شوق سے تھا کہ وہ جذبات و احساسات کے نہایت ہی خام اظہار کے باوجود اپنا کام نبھا جاتی تھی۔ عمر اور تجربے کے ساتھ ساتھ اب وہ بہت پختگی اختیار کر چکی ہے۔ اب اس کو عشق کی دوڑ اور اسکول کی ایک میل کی دوڑ میں تھک کر ہانپنے کانپنے کا فرق معلوم ہے۔ اب تو اس کو سانس کے ہلکے سے ہلکے زیر و بم کا نفسیاتی پس منظر بھی معلوم ہے۔

یہ بہت اچھا ہوا کہ اس نے اداکاری کی منازل آہستہ آہستہ طے کیں۔ اگر وہ ایک ہی جست میں آخری منزل پر پہنچ جاتی۔ تو اہلِ ذوق فلم بینوں کے صنّاعانہ جذبات کو بہت ہی گنوار قسم کا صدمہ پہنچتا۔ اور اگر لڑکپن کے زمانے میں پردے سے الگ زندگی میں بھی وہ ایکٹرس بنی رہتی اور اپنی عمر کو عیار بزازوں کے گز سے

ماپ کر دکھاتی۔ تو میں اس صدمے کی تاب نہ لا کر یقیناً مر گیا ہوتا۔

نرگس ایسے گھرانے میں پیدا ہوئی تھی کہ اس کو لامحالہ ایکٹرس بننا ہی تھا۔ جدّن بائی کے گلے میں بڑھاپے کا گھنگرو بول رہا تھا۔ اس کے دو بیٹے تھے مگر اُس کی ساری توجہ بے بی نرگس پہ مرکوز تھی۔ اس کی شکل و صورت معمولی تھی گلے میں سُر کی پیدائش کا بھی کوئی امکان نہیں تھا۔ مگر جدّن بائی جانتی تھی کہ سر مستعار لیا جا سکتا ہے اور معمولی شکل و صورت میں اندرونی روشنی سے جیسے جوہر کھلتے ہیں دلکشی پیدا کی جا سکتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس نے جان مار کر اس کی پرورش کی۔ اور کانچ کے نہایت ہی نازک اور چھوٹے چھوٹے ذرّے جوڑ جوڑ کر اپنا درخشاں و تاباں خواب پورا کیا۔

جدّن بائی تھی۔ اس کی ماں تھی۔ اس کا موہن بابو تھا۔ بے بی نرگس تھی۔ اس کے دو بھائی تھے۔ اتنا بڑا کنبہ تھا جس کا بوجھ صرف جدّن بائی کے کندھوں پہ تھا موہن بابو ایک بڑے رئیس زادہ تھے۔ جدّن بائی کے گلے کی تانوں اور مرکیوں میں ایسے اُلجھے کہ دین دنیا کا ہوش نہ رہا۔ خوبصورت تھے۔ صاحبِ ثروت تھے۔ تعلیم یافتہ تھے صحت مند تھے۔ مگر یہ سب دولتیں جدّن بائی کے در پر مفلس اور گداگر بن گئیں۔

جدّن بائی کے نام کا اُس زمانے میں ڈنکا بجتا تھا۔ بڑے بڑے نواب اور راجے اُس کے محلوں پر سونے اور چاندی کی بارش برساتے تھے۔ مگر جب بارشیں تھم جاتیں اور آسمان نکھر جاتا تو جدّن بائی اپنے موہن کو اٹھا کر سینے سے لگا لیتی کہ اسی موہن کے پاس اس کا من تھا۔

موہن بابو تا دمِ آخر جدّن بائی کے ساتھ تھے۔ وہ ان کی بہت عزّت کرتی تھی اس لئے کہ وہ راجوں اور نوابوں کی دولت میں غریبوں کے خون کی بُو سُونگھ چکی تھی۔ اس کو اچھی طرح معلوم تھا کہ اُن کے عشق کا دھارا ایک ہی سمت

نہیں بہتا۔ وہ موہن بابو سے محبت کرتی تھی۔ کہ وہ اُس کے بچوں کا باپ تھا۔
خیالات کی رَو میں جانے کدھر بہہ گیا۔ نرگس کو بہرحال ایکٹرس بننا تھا۔
چنانچہ وہ بن گئی۔ اس کے بامِ عروج تک پہنچنے کا راز یہاں تک میں سمجھتا ہوں
اس کا خلوص ہے۔ جو قدم بہ قدم، منزل بہ منزل اس کے ساتھ رہا ہے۔

ایک بات جو اُن ملاقاتوں میں خاص طور پر میں نے محسوس کی وہ یہ ہے۔ کہ نرگس کو
اس بات کا احساس تھا کہ جن لڑکیوں سے وہ ملتی ہے وہ جُدا قسم کے آب و گل سے بنی ہیں
وہ اُن کے پاس آتی تھی۔ گھنٹوں ان سے معصوم معصوم باتیں کرتی تھی۔ مگر وہ اُن کو اپنے گھر
مدعو کرنے میں ایک عجیب قسم کی جھجک محسوس کرتی تھی۔ اس کو شاید یہ ڈر تھا کہ وہ اس کی
دعوت ٹھکرا دیں گی۔ یہ کہیں گی کہ وہ اُس کے یہاں کیسے جا سکتی ہیں۔ میں ایک دن گھر پر
موجود تھا کہ اس نے سرسری طور پر اپنی سہیلیوں سے کہا "اب کبھی تم بھی ہمارے گھر آؤ"
یہ سن کر تینوں بہنوں نے بڑے ہی بیہڈے پن سے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔
وہ شاید یہ سوچ رہی تھیں کہ ہم نرگس کی یہ دعوت کیسے قبول کر سکتی ہیں۔ لیکن میری
بیوی چونکہ میرے خیالات سے واقف تھی۔ اس لئے ایک روز نرگس کے پیہم اصرار
پر اُس کی دعوت قبول کر لی گئی اور مجھے بتائے بغیر تینوں اُس کے گھر چلی گئیں۔

نرگس نے اپنی کار بھیج دی تھی۔ جب وہ بمبے کے خوبصورت ترین مقام
میرین ڈرائیو کے اُس فلیٹ میں پہنچیں جہاں نرگس رہتی تھی۔ تو انھوں نے محسوس
کیا کہ ان کی پر خاص انتظامات کئے گئے تھے۔ موہن بابو اور اُس کے دو نوجوان
لڑکوں کو منع کر دیا گیا تھا کہ وہ گھر میں داخل نہ ہوں۔ کیونکہ نرگس کی سہیلیاں
آ رہی ہیں۔ مرد لوکروں کو بھی اس کمرے میں آنے کی اجازت نہیں تھی۔ جہاں ان
"معزز" مہمانوں کو بٹھایا گیا تھا۔ خود جدّن بائی تھوڑی دیر کے لئے رسمی طور پر ان
کے پاس بیٹھی اور اندر چلی گئی۔ وہ اُن کی معصوم گفتگوؤں میں خارج نہیں ہونا چاہتی تھی۔

نیتنوں بہنوں کا بیان ہے کہ نرگس اُن کی آمد پر پھولی نہ سماتی تھی۔ وہ اس قدر خوش تھی کہ بار بار گھبرا سی جاتی تھی۔ اپنی سہیلیوں کی خاطر داری میں اس نے بڑے جوش کا اظہار کیا۔ پاس ہی پیرزین ڈیئری تھی۔ اس کے "ملک شیک" مشہور تھے۔ گاڑی میں جاکر نرگس خود یہ مشروب جگ میں تیار کرا کے لائی۔ کیونکہ وہ یہ کام نوکر کے سپرد کرنا نہیں چاہتی تھی۔ اس لئے کہ پھر اس کے اندر آنے کا احتمال تھا۔

خاطر داری کے اس جوش و خروش میں نرگس نے اپنے نئے سیٹ کا گلاس توڑ دیا۔ مہمانوں نے افسوس کا اظہار کیا تو نرگس نے کہا "کوئی بات نہیں بی بی غصّے ہونگی مگر ڈیڈی ان کو چپ کرا دیں گے اور معاملہ رفع دفع ہو جائیگا"

موہن بابو کو اس سے اور اس کو موہن بابو سے بہت محبّت تھی۔

"ملک شیک" پلانے کے بعد نرگس نے مہمانوں کو اپنا البم دکھایا جس میں اس کے مختلف فلموں کے اسٹل تھے۔ اُس نرگس میں جو اُن کو یہ فوٹو دکھا رہی تھی۔ اور اُس نرگس میں جو ان تصویروں میں موجود تھی کتنا فرق تھا۔ تینوں بہنیں کبھی اس کی طرف دیکھتیں۔ اور کبھی البم کے اوراق کی طرف اور اپنی حیرت کا یوں اظہار کرتیں "نرگس۔ تم یہ نرگس کیسے بن جاتی ہو"

نرگس جواب میں صرف مسکرا دیتی۔

میری بیوی نے مجھے بتایا کہ گھر میں نرگس کی ہر حرکت، ہر ادا میں الھڑپن تھا۔ اُس میں وہ شوخی، وہ طراری، وہ تیکھا پن نہیں تھا جو اُس کے سراپا میں پردے پر نظر آتا ہے۔ وہ بڑی ہی گھریلو قسم کی لڑکی تھی۔ میں نے خود یہی محسوس کیا تھا۔ لیکن جانے کیوں۔ اس کی چھوٹی چھوٹی آنکھوں میں مجھے ایک عجیب و غریب قسم کی اداسی تیرتی نظر آتی تھی۔ جیسے کوئی لاوارث لاش، تالاب کے ٹھہرے پانی پر ہوا کے ہلکے ہلکے جھونکوں سے ارتعاش پذیر ہے۔

یہ قطعی طور پر طے تھا کہ شہرت کی جس منزل پہ نرگس کو پہنچنا تھا۔ وہ کچھ زیادہ دور نہیں۔ تقدیر اپنا فیصلہ اس کے حق میں کر کے تمام متعلقہ کاغذات اُس کے حوالے کر چکی تھی۔ لیکن پھر وہ کیوں مغموم تھی۔ کیا غیر شعوری طور پہ وہ یہ تو محسوس تو نہیں کر رہی تھی۔ کہ عشق و محبت کا یہ مصنوعی کھیل کھیلتے کھیلتے ایک دن وہ کسی ایسے لق و دق صحرا میں نکل جائے گی۔ جہاں سراب ہی سراب ہوں گے۔ پیاس سے اُس کا حلق سوکھ رہا ہوگا۔ اور آسمان پر چھوٹی چھوٹی بدلیوں کے تھنوں میں صرف اس لئے دودھ نہیں اُترے گا کہ وہ یہ خیال کریں گی کہ نرگس کی پیاس محض بناوٹ ہے۔ زمین کی کوکھ میں پانی کی بوندیں اور زیادہ اندر کو سمٹ جائیں گی۔ اس خیال سے کہ اُس کی پیاس صرف ایک دکھاوا ہے۔ اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ خود نرگس بھی یہ محسوس کرنے لگے کہ میری پیاس کہیں جھوٹی پیاس تو نہیں

اتنے برس گذر جانے پہ میں اب اُسے پہ درپے دیکھتا ہوں۔ تو مجھے اُس کی اداسی کچھ مضمحل سی نظر آتی ہے۔ پہلے اُس میں ایک مستعد جستجو تھی۔ لیکن اب یہ جستجو بھی اداس اور مضمحل ہے کیوں ——؟ اس کا جواب خود نرگس ہی دے سکتی ہے۔

تینوں بہنیں چونکہ چوری چوری نرگس کے ہاں گئی تھیں۔ اس لئے وہ دیر تک اس کے پاس نہ بیٹھ سکیں۔ چھوٹی دو کو یہ اندیشہ تھا کہ ایسا نہ ہو مجھے اس کا علم ہو جائے۔ چنانچہ انھوں نے نرگس سے رخصت چاہی۔ اور واپس گھر آگئیں نرگس کے متعلق وہ جب بھی بات کرتیں۔ گھوم پھر کر اُس کی شادی کے مسئلے پہ آجاتیں۔ چھوٹی دو کو یہ جاننے کی خواہش تھی کہ وہ کب اور کہاں شادی کریگی۔ بڑی جس کی شادی ہوئے پانچ برس ہو چکے تھے۔ یہ سوچتی تھی کہ شادی کے بعد وہ ماں کیسی بنے گی۔

کچھ دیر تک میری بیوی نے نرگس سے اس خفیہ ملاقات کا حال چھپائے رکھا آخر ایک روز بتا دیا۔ میں نے مصنوعی خفگی کا اظہار کیا۔ تو اُس نے سچ سمجھتے ہوئے مجھ سے معافی مانگی اور کہا "واقعی ہم سے غلطی ہوئی۔ مگر خدا کے لئے اب آپ اس کا ذکر کسی سے نہ کیجئے گا"

وہ چاہتی تھی کہ بات مجھی تک رہے۔ ایک ایکٹرس کے گھر جانا تینوں بہنوں کے نزدیک بہت ہی معیوب بات تھی۔ وہ اس "حرکت" کو چھپانا چاہتی تھیں۔ چنانچہ جہاں تک مجھے معلوم ہے۔ اس کا ذکر انھوں نے اپنی ماں سے بھی نہیں کیا تھا۔ حالانکہ وہ بالکل تنگ خیال نہیں تھیں۔

میں اب تک نہیں سمجھ سکا کہ ان کی وہ حرکتِ مذموم کیوں تھی۔ اگر وہ نرگس کے ہاں گئی تھیں تو اس میں برائی ہی کیا تھی۔ اداکاری معیوب کیوں سمجھی جاتی ہے۔ کیا ہمارے اپنے خاندان کے حلقے میں ایسے افراد نہیں ہوتے جن کی ساری عمر فریب کاریوں اور ملمع کاریوں میں گذر جاتی ہے۔ نرگس نے تو اداکاری کو اپنا پیشہ بنایا تھا۔ اُس نے اس کو راز بنا کر نہیں رکھا تھا۔ کتنا بڑا فریب جس میں یہ لوگ مبتلا رہتے ہیں۔

اس مضمون کے آغاز میں میں نے ایک خط کا کچھ حصہ نقل کیا ہے جو مجھے تسنیم سلیم نے لکھا تھا۔ اب اس کی طرف لوٹتا ہوں۔ دراصل ساری بات ہی اسی سے چلی تھی۔

چونکہ مجھے نرگس کو اُس کے گھر میں ملنے کا اشتیاق تھا۔ اس لئے میں مصروف ہونے کے باوجود مسٹر سلیم اور اُن کے مصاحبوں کے ساتھ میرین ڈرائیو چل پڑا۔ چاہئے تو یہ تھا۔ کہ میں فون کے ذریعے سے جدن بائی کو اپنی آمد سے مطلع کر دیتا اور یہ بھی معلوم کر لیتا کہ نرگس فارغ بھی ہے یا نہیں۔ لیکن

میں عام زندگی میں بھی چونکہ ایسے تکلفات کا قائل نہیں۔ اس لئے بغیر اطلاع دیئے دھمکا۔ جدن بائی باہر برآمدے میں بیٹھی سروتے سے چھالیا کاٹ رہی تھی۔ مجھے دیکھا تو باآواز بلند کہا "اوہ منٹو ـــــ آؤ۔ بھائی آؤ" پھر نرگس کو آواز دی۔ "بےبی .... تمہاری سہیلیاں آئی ہیں"

میں نے قریب جا کر اُسے بتایا کہ میرے ساتھ سہیلیاں نہیں "سہیلے" ہیں۔ جب میں نے نواب چھتاری کے داماد کا ذکر کیا تو اُس کا لہجہ بدل گیا "بلالو انہیں"۔ نرگس دوڑی دوڑی آئی۔ تو اُس سے کہا "تم اندر جاؤ بےبی۔ منٹو صاحب کے دوست آئے ہیں"

جدن بائی نے میرے دوستوں کی کچھ اس انداز سے آؤ بھگت کی۔ جیسے وہ مکان دیکھنے اور پسند کرنے آئے تھے۔ وہ بے تکلفی جو میرے لئے مخصوص تھی۔ غائب ہو گئی۔ بیٹھو تشریف رکھئے میں تبدیل ہو گیا۔ کیا پیو گے۔ کیا نوش فرمائیے گا میں گیا۔ تم آپ ہو۔ اور میں خود کو چغد محسوس کرنے لگا۔

میں نے اپنی اور اپنے دوستوں کی آمد کا مدعا بیان کیا۔ تو جدن بائی نے بڑے پرتصنع انداز میں مجھ سے مخاطب ہوتے ہوئے میرے ساتھیوں سے کہا۔ "بےبی سے ملنا چاہتے ہیں .... کیا بتاؤں کئی دنوں سے غریب کی طبیعت ناساز ہے۔ دن رات کی شوٹنگ نے اُسے بے حد مضمحل کر دیا ہے۔ بہت منع کرتی ہوں۔ کہ ایک روز آرام کرلو۔ مگر شوق ایسا ہے کہ نہیں سنتی محبوب نے بھی کہا کہ بیٹا کوئی حرج نہیں۔ تم ریسٹ کر لو۔ میں شوٹنگ بند کر دیتا ہوں۔ مگر نہ مانی .... آج میں نے زبردستی روک لیا .... زکام سے نڈھال ہو رہی ہے غریب!"

یہ سن کر میرے دوستوں کو ظاہر ہے۔ بہت مایوسی ہوئی۔ نرگس کی ایک جھلک وہ ٹیکسی میں بیٹھے بیٹھے دیکھ چکے تھے اور اُس کو مفصل طور پر دیکھنے کے لئے

بے تاب تھے جب ان کو معلوم ہوا۔ کہ اُس کی طبیعت ناساز ہے تو انھیں بڑی کوفت ہوئی۔ جدّن بائی اِدھر اُدھر کی باتیں کئے جاتی تھی جن سے ان کو کوئی دلچسپی نہ تھی۔ میں صاف دیکھ رہا تھا کہ وہ تھوڑی دیر کے بعد جمائیاں لینے لگیں گے اور مجھے یہ بھی معلوم تھا کہ نرگس کی ناسازئ طبیعت کا بہانہ محض رسمی ہے چنانچہ میں نے جدّن بائی سے کہا "بے بی کو زحمت تو ہوگی۔ مگر یہ اتنی دور سے آئے ہیں۔ ذرا بلا لیجئے"

اندر تین چار مرتبہ کہلوانے کے بعد نرگس آئی۔ سب نے اُٹھ کر تعظیماً اُسے سلام کیا۔ میں بیٹھا رہا۔ نرگس کا داخلہ فلمی تھا۔ اُس کا سلام کا جواب دینا فلمی تھا۔ اُس کا بیٹھنا اُٹھنا فلمی تھا۔ اُس کی گفتگو فلمی تھی۔ جیسے سیٹ پر مکالمے بول رہی ہو۔

اور میرے ساتھیوں کے سوال جواب بڑے ہی نوابانہ قسم کے اوٹ پٹانگ تھے۔

"آپ سے مل کر بڑی مسرت ہوئی"

"جی ہاں آج ہی بمبے پہنچے ہیں"

"کل پرسوں واپس چلے جائیں گے"

"آپ ماشاء اللہ اس وقت ہندوستان کی چوٹی کی اداکارہ ہیں"

"آپ کے ہر فلم کا ہم نے پہلا شو دیکھا ہے"

"یہ تصویر جو آپ نے دی ہے میں اسے اپنے البم میں لگاؤں گا"

اس دوران میں موہن بابو بھی آگئے۔ مگر وہ خاموش بیٹھے رہے۔ کبھی کبھی اپنی بڑی بڑی خوبصورت آنکھیں گھما کر ہم سب کو دیکھ لیتے۔ اور پھر خدا جانے کس سوچ میں غرق ہو جاتے۔

سب سے زیادہ باتیں جدّن بائی نے کیں۔ ان میں اس نے ملاقاتیوں پر بڑے

واضح الفاظ میں ظاہر کر دیا کہ وہ ہندوستان کے راجے اور ہر نواب کو اندر باہر سے اچھی طرح جانتی ہے۔ نرگس نے جتنی باتیں کیں بہت مختصر اور بناوٹ سے بھرپور تھیں اس کی ہر حرکت اور ہر ادا سے یہ صاف مترشح تھا کہ وہ اپنے ملنے والوں کو یہ چیزیں پلیٹ میں ڈال کر بڑے تکلف سے پیش کر رہی ہے۔ تاکہ وہ اس کا شکریہ ادا کریں۔ وہ دلی طور پہ ممنون و متشکر تھے۔ مگر اس امتنان و تشکر سے نرگس متشفی نہیں تھی۔ وہ غالباً جواب میں تصنع ہی کی طالب تھی۔

یہ ملاقات کچھ بہت ہی پھیکی رہی میرے لئے بھی اور میرے ساتھیوں کے لئے بھی۔ میری موجودگی میں وہ کھل کر احمقانہ باتیں نہیں کر سکتے تھے اور میں ان کی موجودگی کے باعث بہت ہی تکلیف دہ گھٹن محسوس کرتا رہا تھا بہر حال نرگس کا دوسرا رنگ دیکھنا دلچسپی سے خالی نہیں تھا۔

سلیم اپنے دوستوں کے ساتھ دوسرے روز پھر نرگس کے ہاں گئے۔ اس کی اطلاع انھوں نے مجھے نہ دی۔ میرا خیال ہے اس ملاقات کا رنگ کچھ اور ہی ہوگا۔ نخشب کے ساتھ جس جنگ کا ذکر تسنیم نے اپنے خط میں کیا ہے وہ مجھے بالکل یاد نہیں۔ ہو سکتا ہے۔ کہ وہ اُس وقت وہاں موجود ہوں۔ کیونکہ جدّن بائی کو شعر و شاعری سے بڑی دلچسپی تھی اور بمبے کے اکثر شعرا اپنا کلام سنانے کے لئے وہاں جایا کرتے تھے۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ نخشب سے ان کی شاعری ہی پر اختلاف رائے کے باعث ہلکی سی بحث ہو گئی ہو۔

نرگس کا ایک اور دلچسپ رنگ میں نے اس وقت دیکھا جب اشوک میرے ساتھ تھا۔ جدّن بائی کوئی اپنا ذاتی فلم تیار کرنے کا ارادہ کر رہی تھی۔ اس کی خواہش تھی کہ اشوک اس کا ہیرو ہو۔ اشوک حسبِ عادت اکیلا جانے سے گھبراتا تھا چنانچہ وہ مجھے اپنے ساتھ لے گیا۔

دورانِ گفتگو میں کئی نکتے تھے۔ کاروباری نکتے، دوستانہ نکتے۔ خوشامدی نکتے یہ نکتے بڑے ہی دلچسپ طریقے پر آپس میں گڈمڈ ہوتے رہے۔ جدّن بائی کا انداز کبھی بزرگانہ ہوتا تھا اور کبھی عصرانہ۔ وہ کبھی پروڈیوسر بن جاتی تھی اور کبھی نرگس کی ماں۔ ایسی ماں جو اپنی بیٹی کی قدر و قیمت بڑھانا چاہتی ہے۔ موہن بابو سے کبھی کبھی ہاں میں ہاں ملالی جاتی تھی۔

لاکھوں روپے کا ذکر آیا۔ وہ جو خرچ ہو چکے تھے۔ خرچ ہونے والے تھے۔ اور جو خرچ کیے جا سکتے تھے۔ سب کا حساب انگلیوں پر گنوایا گیا۔ نرگس کا یہ انداز تھا کہ دیکھو اشوک، مانتی ہوں کہ تم مجھے ہوئے ایکٹر ہو۔ تمہاری دھاک بیٹھی ہوئی ہے مگر میں بھی کسی طرح کم نہیں۔ تم مان جاؤ گے کہ میں اداکاری کے میدان میں تمہارا مقابلہ کر سکتی ہوں۔ چنانچہ اس کی تمام کوششیں اس نقطے پر مرکوز تھیں۔ اس کے علاوہ کبھی کبھی اس کے اندر عورت بھی بیدار ہو جاتی تھی۔ اس وقت وہ اشوک سے یہ کہتی معلوم ہوتی "تم پر ہزاروں لڑکیاں فریفتہ ہیں۔ لیکن میں اسے کیا سمجھتی ہوں۔ میرے بھی ہزاروں چاہنے والے موجود ہیں۔ یقین نہ آئے تو کسی مرد سے پوچھ لو" اور ساتھ ہی ساتھ اس چیلنج کی ہلکی سی جھلک بھی ہوتی "ہو سکتا ہے تم ہی مجھ پر مرنا شروع کر دو"

اور جدّن بائی کبھی مصالحت کی طرف جھک جاتی کہ نہیں، اشوک تم اور بے بی دونوں پر دنیا مرتی ہے۔ اسی لئے تو میں چاہتی ہوں کہ تمہیں ایک ساتھ پیش کروں تاکہ قتلِ عام ہو اور ہم سب خوب فائدہ اٹھائیں۔ کبھی کبھی وہ ایک اور انداز اختیار کر لیتی اور مجھ سے مخاطب ہوتی۔

"منٹو، اشوک اتنا بڑا ایکٹر بن گیا ہے۔ لیکن خدا کی قسم بہت ہی نیک آدمی ہے بڑا کم گو بڑا ہی شرمیلا ــــ خدا عمر دراز کرے۔ میں جو فلم شروع کر رہی ہوں

اس میں اشوک کے لئے خاص طور پر میں نے کیریکٹر لکھوایا ہے۔ تم سنو گے تو خوش ہو جاؤ گے۔

میں یہ کیریکٹر سنے بغیر ہی خوش تھا۔ اس لئے کہ جدّن بائی کا کیریکٹر خود بہت ہی دلچسپ تھا۔ اور نرگس جو رول ادا کر رہی تھی وہ تو اور بھی زیادہ دلچسپ تھا میرا خیال ہے اگر پردے پر وہ حالات پیش کئے جاتے اور اس سے کہا جاتا کہ اشوک سے مل کر تمہیں ایسی گفتگو کرنا ہے تو وہ کبھی اتنی کامیاب نہ ہوتی جتنی کہ وہ اشوک سے واقفیت تھی۔

باتوں باتوں میں ثریا کا ذکر آیا تو جدّن بائی نے ناک بھوں چڑھا کر اس میں اور اس کے سارے خاندان میں کیڑے ڈالنے شروع کر دئے۔ ثریّا کی عیب جوئی وہ ایک فرض کے طور پر کرتی تھی۔ اس کا گلا خراب ہے ـــــ بے سُری ہے بے اُستادی ہے۔ دانت بڑے واہیات ہیں۔ اُدھر ثریّا کے ہاں جاؤ تو نرگس اور جدّن بائی پر عملِ جراحی شروع ہو جاتا تھا۔ ثریّا کی نانی جو حقیقت میں اس کی ماں تھی حقّے کے بتے اڑا اڑا کر دونوں کو خوب کوستی تھی۔ نرگس کا ذکر آتا تو وہ بُرا سا مُنہ بنا کر میراثنوں کے انداز میں جگت کرتی۔ منھ دیکھو جیسے گلا سڑا پپیتا ہوتا ہے۔

موہن بابو کی خوبصورت اور بڑی بڑی آنکھیں ہمیشہ ہمیشہ کے لئے مندچکی ہیں۔ جدّن اپنے دل کی بقایا حسرتیں اور تمنّائیں لئے منوں مٹّی کے نیچے دفن ہے۔ اس کی بے بی، نرگس تصنّع اور بناوٹ کے آخری زینے پر پہنچ کر معلوم نہیں اور اوپر دیکھ رہی ہے یا اس کی اداس اداس آنکھیں نیچے سب سے پہلے زینے کو دیکھ رہی ہیں جب اس نے گھٹنیوں چلنا سیکھا تھا۔ وہ خیرہ کن روشنی میں تاریک ترین سائے کی تلاش میں ہے۔ یا تاریک ترین سائے میں روشنی کی ننھی سی کرن ٹٹول رہی ہے؟ ـــ روشنی اور سائے کا تانا بانا ہی زندگی ہے۔ اور اس تانے بانے کی عکاسی فلمی زندگی جس میں کبھی ایسا پیچ، ایسا خم بھی آ جاتا ہے جب روشنی رہتی نہ سایہ نہ سایہ!

# کشتِ زعفران

لائٹس اون ــــ فین اوف ــــ کیمرہ ریڈی ــــ سٹارٹ مسٹر جگناپ!"

"سٹارٹ"

"سین تھرٹی فور ــــ ٹیک ٹن۔"

"نیلا دیوی آپ کچھ فکر نہ کیجئے۔ میں نے بھی لپشاور کا پیشاب پیا ہے!"

"کٹ کٹ"

لائٹس اون ہوئیں۔ وی ایچ ڈلیسائی نے رائفل ایک طرف رکھتے ہوئے بڑے اطمینان سے اشوک سے پوچھا۔ او کے مسٹر گنگولی؟"

اشوک نے جو جل بھن کر راکھ ہونے کے قریب تھا۔ قہر آلود نگاہوں سے خلا میں دیکھا۔ اور زہر کے چند بڑے بڑے گھونٹ جلدی جلدی پی کر چہرے پر مصنوعی خوشی کا اظہار کرتے ہوئے ڈلیسائی سے کہا۔ "ونڈر فل ــ پھر اس نے معنی خیز نظروں سے میری طرف دیکھا"۔ کیوں منٹو؟"

میں نے ڈلیسائی کو گلے لگا لیا۔ "ونڈر فل"

ہمارے چاروں طرف لوگ اپنی اپنی ہنسی کا بہت بری طرح گلا گھونٹ رہے تھے۔ ڈلیسائی بہت خوش تھا۔ چوں کہ اس نے بہت دیر کے بعد میرے منہ سے اپنی اس قدر پر جوش تعریف سنی تھی۔ دراصل اشوک نے کچھ عرصہ پہلے

مجھے منع کر دیا تھا۔ کہ میں اپنی جھنجھلاہٹ کا اظہار ہرگز ہرگز نہ کروں۔ کیوں کہ اُسے اندیشہ تھا۔ کہ ڈلیسائی بوکھلا جائے گا۔ اور سارا دن غارت کر دے گا۔

جب چند لمحات گذر گئے۔ تو ڈلیسائی نے مکالمہ آموز ڈکشٹ سے کہا۔

"ڈکشٹ صاحب نکسٹ ڈائلاگ؟"

یہ سن کر اشوک جو کہ "آٹھ دن" نامی فلم ڈائرکٹ کر رہا تھا۔ مجھ سے مخاطب ہوا۔ "منٹو، میرا خیال ہے، پہلا ڈائلاگ ایک دفعہ اور لے لیں۔"

مَیں نے ڈلیسائی کی طرف دیکھا۔ "کیوں ڈلیسائی صاحب؟ — میرا خیال ہے۔ اِس دفعہ اور بھی ونڈر فُل ہو جائے۔"

ڈلیسائی نے گجراتی انداز میں اپنا سر ہلایا۔ "ہو — تو لے لو ابھی۔ گرما گرم معاملہ ہے۔"

دتّا رام چلّایا۔ لائٹس اون۔"

لائٹس روشن ہوئیں، ڈلیسائی نے رائفل سنبھالی۔

ڈکشٹ جھٹ سے ڈلیسائی کی طرف لپکا۔ اور مکالموں کی کتاب کھول کر کہنے لگا۔ مسٹر ڈلیسائی۔ ذرا وہ ڈائلاگ یاد کر لیجیے۔"

ڈلیسائی نے پُوچھا۔ "کون سا ڈائلاگ؟"

ڈکشٹ نے کہا۔ "وہی جو آپ نے اتنا ونڈر فل بولا تھا۔ ذرا اُسے دُہرا دیجیے۔"

ڈلیسائی نے رائفل کندھے پر جماتے ہوئے بڑے سنگین اعتماد سے کہا۔ "مجھے یاد ہے۔"

ڈکشٹ نے مجھے اشارہ کیا۔ "منٹو صاحب ذرا آپ سُن لیجیے۔"

مَیں نے ڈلیسائی کے کاندھے پر ہاتھ رکھا۔ اور بڑے غیر سنجیدہ لہجے میں کہا۔

ہاں، تو وہ کیا ہے، ڈلیسائی صاحب ـــــ نیلا دیوی، آپ کوئی فکر نہ کیجئے۔ میں نے بھی پشاور کا پانی پیا ہے۔"

ڈلیسائی نے اپنے سر پر پشاوری لنگی کا زاویہ درست کیا۔ اور ویرا (فلم میں نیلا دیوی) سے مخاطب ہو کر کہا۔ نیلا دیوی، آپ کوئی پشاور نہ کیجئے۔ میں نے بھی آپ کا پانی پیا ہے۔"

ویرا اس قدر بے تحاشا ہنسی کہ ڈلیسائی ڈر گیا۔ "کیا ہوا مس ویرا؟"

ویرا ساڑھی کے آنچل میں ہنسی دباتی سیٹ سے باہر چلی گئی۔ ڈلیسائی نے تشویش ظاہر کرتے ہوئے ڈکشٹ سے پوچھا۔ "کیا بات تھی؟"

ڈکشٹ نے اپنا ہنسی سے اُبلتا ہوا منہ دوسری طرف کر دیا۔ میں نے ڈلیسائی کی پریشانی دور کرنے کے لئے کہا۔ نتھنگ سیریس ـــــ کھانسی آ گئی۔"

ڈلیسائی ہنسا۔ "اوہ" پھر وہ مستعد ہو کر اپنے مکالمے کی ـــــ طرف متوجہ ہوا۔

"نیلا دیوی آپ کوئی کھانسی نہ کیجئے۔ میں نے بھی دیوی کا ....."

اشوک اپنے سر کو مکّے مارنے لگا۔ ڈلیسائی نے دیکھا۔ تو متفکر ہو کر اس سے پوچھا۔ "کیا بات ہے مسٹر گنگولی۔"

گنگولی نے ایک زور کا مکّا اپنے سر پہ مارا۔ "کچھ نہیں۔ سر میں درد تھا۔ ـــــ تو ہو جائے ٹیک؟"

ڈلیسائی نے اپنا کدّو سا سر ہلایا۔ "ہو!"

گنگولی نے مردہ آواز میں کہا۔ کیمرہ ریڈی ـــــ ریڈی مسٹر جگتاپ؟"

پھونپو سے جگتاپ کی منمناہٹ سنائی دی ـــــ "ریڈی!"

گنگولی نے اور زیادہ مردہ آواز میں کہا۔

"سٹارٹ۔"

کیمرہ اسٹارٹ ہوا۔ کلیپ اسٹک ہوئی۔

"سین تھرٹی فور ——— ٹیک الیون!"

ڈلیپائی نے رائفل لہرائی۔ اور وہیڑا سے کہنا شروع کیا۔"نیلا پانی۔ آپ کوئی دیوی نہ کیجئے۔ میں نے بھی پشاور کا ......"

اشوک دیوانہ وار چلایا۔"کٹ کٹ۔"

ڈلیپائی نے رائفل فرش پر رکھی۔ اور گھبرا کر اشوک سے پوچھا۔"اینی مسٹیک مسٹر گنگولی؟"

اشوک نے ڈلیپائی کی طرف قاتلانہ نگاہوں سے دیکھا۔ مگر فوراً ہی ان میں بھیڑوں کی سی نرمی اور معصومیت پیدا کرتے ہوئے کہا۔"کوئی نہیں ——— بہت اچھا تھا ——— بہت ہی اچھا۔" پھر وہ مجھ سے مخاطب ہوا۔"آؤ منٹو، ذرا باہر چلیں!"

سیٹ سے باہر نکل کر اشوک قریب قریب رو دیا۔"منٹو، بتاؤ، اب کیا کیا جائے۔ صبح سے یہ وقت ہو گیا ہے۔ پشاور کا پانی اس کے منہ پر چڑھتا ہی نہیں ——— میرا خیال ہے، لنچ کے لئے بریک کر دیں۔"

بڑا معقول خیال تھا۔ کیوں کہ ڈلیپائی سے یہ فوری توقع بالکل فضول تھی۔ کہ وہ صحیح مکالمہ بول سکے گا۔ ایک دفعہ اگر اس کی زبان پر کوئی چیز جم جائے۔ تو بڑی مشکل سے ہٹتی ہے۔ اصل میں اس کا حافظہ بالکل صفر تھا۔ اسے چھوٹے سے چھوٹا مکالمہ بھی یاد نہیں رہتا تھا۔ اگر سیٹ پر وہ پہلی بار کوئی مکالمہ صحت کے ساتھ ادا کر جاتا۔ تو اسے محض اتفاق سمجھا جاتا تھا۔ مگر لطف یہ ہے۔ کہ غلط ادائیگی کے باوجود ڈلیپائی کو قطعاً اس بات کا احساس نہیں ہوتا تھا۔ کہ اس نے مکالمے کو کس حد تک ——— کس رُلا دینے والی حد تک مسخ کیا ہے۔

مکالمے کی ٹانگ توڑ کر اس کو مکمل طور پہ اپاہج کر کے وہ عام طور پہ حاضرین

کی طرف داد طلب نگاہوں سے دیکھا کرتا تھا۔ اُس کی ایک دو لڑکھڑاہٹیں یقیناً تفریح کا موجب ہوتی تھیں۔ مگر جب وہ حد سے تجاوز کر جاتا۔ تو سب کے دل میں یہ خواہش پیدا ہوتی کہ اُس کے سر کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیئے جائیں۔

میں فلمستان میں تین برس رہا۔ اس دوران میں ڈلیسائی نے چار فلموں میں حصّہ لیا۔ مجھے یاد نہیں کہ اُس نے ایک مرتبہ بھی پہلے ہی مرحلے میں اپنا مکالمہ صحت سے ادا کیا ہو۔ اگر حساب لگایا جائے۔ تو آنجہانی نے اپنی فلمی زندگی میں لاکھوں فٹ فلم ضائع کیا ہوگا۔

اشوک نے مجھے بتایا۔ کہ ڈلیسائی کی "ری ٹیکس" کا ریکارڈ بچھتر ہے۔ یعنی بمبے ٹاکیز میں اُس نے ایک بار ایک مکالمے کو چوہتر مرتبہ غلط ادا کیا۔ یہ صرف جرمن ڈائرکٹر فرانز اوسٹن ہی کا حوصلہ تھا۔ کہ وہ بہت دیر تک ضبط کیئے رہا۔ آخر اُس کا پیمانۂ صبر لبریز ہوگیا۔ سر سیٹ کر اُس نے ڈلیسائی سے کہا۔ مسٹر ڈلیسائی مصیبت یہ ہے۔ کہ لوگ تمھیں پسند کرتے ہیں۔ تمھیں پردے پر دیکھتے ہی ہنسنا شروع کر دیتے ہیں۔ ورنہ آج میں نے تمھیں ضرور اُٹھا کر باہر پھینک دیا ہوتا۔"

اور فرانز اوسٹن کی اس صاف گوئی کا نتیجہ یہ ہوا۔ کہ چوہتر ری ٹیک ہوئے اور اسٹڈیو کے ہر کارکن کو باری باری ڈلیسائی کو دم دلاسے دینے کا فرض ادا کرنا پڑا۔ لیکن کوئی حیلہ کارگر نہیں ہوتا تھا۔ وہ ایک بار اُکھڑ جائے۔ تو کوئی دوا یا دعا با اثر ثابت نہیں ہوتی۔ ایسے وقتوں میں چنانچہ یہی مناسب خیال کیا جاتا تھا۔ کہ نتیجہ خدا کے ہاتھ سونپ کر دھڑا دھڑ فلم ضائع کیا جائے۔ جب اُس کی اور ڈلیسائی کی مرضی بیک وقت شاملِ حال ہو جائے۔ تو سجدۂ شکرانہ ادا کرے۔

اشوک نے لنچ کے لئے بریک کر دیا۔ جیسا کہ عام دستور تھا۔ کسی نے ڈلیسائی سے مکالمے کے بارے میں گفت گو نہ کی۔ تاکہ جو کچھ ہو چکا ہے۔ اُس کی یاد تازہ نہ

ہو۔ اشوک اِدھر اُدھر کی گپیں سناتا رہا۔ ڈلیسائی نے حسبِ معمول اپنی طرف سے مزاح انگیز باتیں کیں جن میں ذرّہ برابر مزاح نہیں تھا۔ لیکن سب ہنستے رہے۔ لنچ ختم ہوا۔ شوٹنگ پھر شروع ہوئی۔ اشوک نے اُس سے پوچھا۔ کیوں ڈلیسائی صاحب، آپ کو ڈائلاگ یاد ہے؟"

ڈلیسائی نے بڑے وثوق کے ساتھ کہا ـــــ "جی ہو!"

لائٹس اون ہوئیں۔ سین تھرٹی فور، ٹیک ٹو لو شروع ہوا۔ ڈلیسائی نے رائفل لہرا کر دیرآسے کہا۔ "نیلا دیوی..... آپ ـــــ آپ" اور ایک دم رک گیا۔ "آئی ایم سوری۔"

اشوک کا دل بیٹھ گیا۔ لیکن اُس نے ڈلیسائی کا دل رکھنے کے لیے کہا۔ "کوئی بات نہیں ـــــ جلدی کیجیے۔"

سین تھرٹی فور، ٹیک تھرٹین۔" شروع ہوا۔ مگر ڈلیسائی نے پیشاور سے پیشاب کو الگ نہ کیا۔ جب چند اور کوششیں بھی بار آور نہ ہوئیں۔ تو میں نے الگ لے جا کر اشوک کو یہ مشورہ دیا۔ "دادا منی، دیکھو یوں کرو ـــــ جب ڈلیسائی یہ مکالمہ ادا کرتا ہے۔ تو وہ کیمرے کی طرف پیٹھ کرتے ہوئے اُس کا بقایا حصّہ ادا کرے۔ یعنی، پیشاور کا پیشاب پیا ہے۔ کیمرے کے سامنے مسخرہ کر کے نہ بولے۔"

اشوک سمجھ گیا۔ کیوں کہ اس مشکل سے نکلنے کی ایک صرف یہی ترکیب تھی۔ کیوں کہ ہم بڑی آسانی سے یہ مکالمہ بعد میں "ڈب" کر سکتے تھے۔ اگر وہ سارا مکالمہ کیمرے کے سامنے مسخرہ کر کے ادا کرتا تو اُس کے ہونٹوں کی جنبش صحیح مکالمے کے ساتھ چسپاں نہ ہو سکتی۔

جب ڈلیسائی کو یہ ترکیب سمجھائی گئی۔ تو اُسے بہت ٹھیس پہنچی۔ اُس نے ہم سب کو یقین دلانے کی ہر ممکن کوشش کی وہ اب غلطی نہیں کرے گا۔ مگر پانی سر سے

گزر چکا تھا ـــــ اور وہ بھی پشاور کا، اس لئے اس کی متنت سماجت بالکل نہ سُنی گئی۔ بلکہ اُس سے کہہ دیا گیا۔ کہ وہ جو اُس کے دل میں آئے بول دے۔

ڈلیسائی بہت بد دل ہُوا۔ لیکن اُس نے مجھ سے کہا: "کوئی بات نہیں منٹو۔ میں منھ دوسری طرف موڑ لوں گا۔ لیکن آپ دیکھئے گا۔ کہ میں ڈائلاگ بالکل کورکٹ بولوں گا۔"

"سین تھرٹی فور ـــــ ٹیک فورٹین" کی آواز آئی۔ ڈلیسائی نے بڑے عزم کے ساتھ رائفل ہوا میں لہرائی۔ اور ڈیرا سے مخاطب ہو کر کہا۔ نیلا دیوی آپ کوئی فکر نہ کیجئے۔ یہ کہہ کر وہ مُڑا: "میں نے بھی پشاور کا پیتاب پیا ہے۔"

سین کٹ ہُوا۔ ڈلیسائی نے فتح مندانہ انداز میں رائفل کندھے پر رکھی۔ اور اشوک سے پوچھا۔ کیوں مسٹر گنگولی؟" اشوک اب بالکل سنگ دل بن چکا تھا۔ اُس نے بڑے روکھے انداز میں کہا۔ ٹھیک ہے ٹھیک ہے ـــ" پھر وہ کیمرہ مین ہریپ سے مخاطب ہُوا۔ چلو نیکسٹ شوٹ!"

شوٹنگ ختم ہوئی، مجھے اپنے ایک دوست کے ساتھ چرچ گیٹ جانا تھا۔ اس لئے ہم جلدی جلدی اسٹیشن پہنچے۔ گاڑی کھڑی تھی۔ ہم ایک ڈبے میں بیٹھ گئے۔ کیا دیکھتے ہیں۔ کہ ڈلیسائی صاحب بھی براجمان ہیں۔ اور مسافروں کو اپنے کارنامے سنا رہے ہیں ـــ میرا دوست جو اُس دن کی شوٹنگ دیکھ چکا تھا۔ ڈلیسائی کے پاس بیٹھ گیا۔ دورانِ گفتگو میں اُس نے ایک بڑا بے ڈھب سا سوال کیا۔

سیٹ پر جو لوگ ڈائلاگ بھول جاتے ہیں۔ اُس کا کیا علاج کیا جاتا ہے۔ ڈلیسائی نے جواب دیا۔ "معلوم نہیں۔ میں تو ایک دفعہ بھی نہیں بھولا۔"

اُس کا یہ جواب بے حد معصوم تھا۔ جیسے وہ ڈائلاگ بھول جانے کے

مرض سے قطعاً نا آشنا ہے ـــــ میرا خیال ہے. کہ خود اُس کو اس کا کامل یقین تھا۔ کہ اُس سے کوئی غلطی سرزد نہیں ہوتی۔ اور یہ درست تھا. اس لیئے کہ غلطی کا احساس تو صرف اُسی صورت میں پیدا ہو سکتا ہے۔ اگر صحت کے متعلق ہلکا سا تصوّر انسان کے دماغ میں موجود ہو۔ ڈلیسائی مرحوم کے دماغ میں کوئی ایسا خانہ ہی نہیں تھا۔ جو غلط اور صحیح میں تمیز کر سکے. وہ اِس سے بالکل بے نیاز تھا. معصومیّت کی حد تک وہ لوگ جو یہ سمجھتے ہیں. کہ وہ بہت بڑا مزاح کار تھا. یکسر غلط ہے. وہ جو یہ سمجھتے ہیں. کہ وہ بہت بڑا کردارِ کار تھا۔ قطعاً نا درست ہے. ایسا گناہ آنجہانی سے کبھی سرزد نہیں ہُوا، لوگ اگر اُس کی حرکات پر ہنس ہنس کے دوہرے ہوتے تھے. تو اُس کا باعث قدرت کی چھیڑ خانی تھی۔ خداوند تعالیٰ نے اُس کی تخلیق ہی ایسے آب و گل سے کی تھی. جس میں زعفران گندھی ہو۔

ایک دفعہ ریس کورس پر میں نے دور سے اُس کی طرف اشارہ کیا. اور اپنی بیوی سے کہا۔ وہ ڈلیسائی ہے ـــ وہ!"

میری بیوی نے اُس جانب دیکھا، اور بے اختیار ہنسنا شروع کر دیا۔ میں نے اُس سے پوچھا۔ "اتنی دُور سے دیکھنے پر اس قدر بے تحاشا ہنسنے کی وجہ کیا ہے؟"

وہ میرے سوال کا اطمینان بخش جواب نہ دے سکی. صرف یہ کہہ کر وہ اور زیادہ ہنسنے لگی۔ "معلوم نہیں۔"

آنجہانی کو ریس کا بہت شوق تھا. اپنی بیوی اور لڑکی کو ساتھ لاتا تھا۔ مگر دس روپے سے زیادہ کبھی نہ کھیلتا تھا۔ اُس کے بیان کے مطابق کئی جج کی اُس کے بہت ہی قریبی دوست تھے. جو اُس کو سولہ آنے کھری ٹپ دیتے

تھے۔ یہ ٹپ وہ اکثر دوسروں کو دیتا تھا۔ اس درخواست کے ساتھ کہ وہ اسے اپنے تک رکھیں، اور کسی اور کو نہ بتائیں۔ خود وہ کسی اور کی دی ہوئی ٹپ پر کھیلتا تھا۔

ریس کورس پر جب میں نے اُس کو اپنی بیوی سے متعارف کرایا۔ تو اس نے ایک "شیور" یعنی یقینی ٹپ دی۔ جب وہ نہ آئی۔ تو اُس نے میری بیوی سے پُرتعجب لہجے میں کہا۔ "حد ہوگئی ہے — یہ ٹپ تو آنا ہی مانگتی تھی" اُس نے خود ایک دوسرے نمبر کا گھوڑا کھیلا تھا۔ جو لیس آگیا تھا۔ اِس پر اُس نے کسی قسم کے تعجب کا اظہار نہیں کیا تھا۔

ڈیسائی آنجہانی کی اوائلِ زندگی کے متعلق لوگوں کی معلومات بہت محدود ہیں۔ خود میں صرف اتنا جانتا ہوں۔ کہ وہ گجرات کے ایک متوسط گھرانے کا فرد تھا۔ بی۔ اے کرنے کے بعد اُس نے ایل، ایل، بی کیا چھ سات برس تک بمبے کی چھوٹی عدالتوں کی خاک چھانتا رہا۔ اُس کی پریکٹس معمولی تھی۔ لیکن اس کا گھر بار چلانے کے لئے کافی تھی۔ لیکن جب وہ دماغی عارضے میں گرفتار ہُوا۔ تو اُس کی مالی حالت بہت پتلی ہوگئی۔ ایک عرصے تک وہ نیم پاگل رہا۔ علاج معالجے سے یہ عارضہ دُور تو ہوگیا۔ مگر ڈاکٹروں نے دماغی کام کرنے سے منع کر دیا۔ کیوں کہ خطرہ تھا۔ کہ مرض پھر عود نہ کر آئے — اب ڈیسائی غریب کے لئے بڑی مشکل تھی۔ کہ وہ کرے تو کیا کرے۔ وکالت ظاہر ہے کہ یکسر دماغی کام تھا۔ اس لئے ادھر رجوع کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ کچھ عرصہ تک وہ اِدھر اُدھر ہاتھ پاؤں مارتا رہا۔ تجارت سے اُسے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ حالانکہ اُس کی رگوں میں ٹھیٹ گجراتی خون تھا۔

جب حالات بہت نازک ہو گئے۔ تو وہ ساگر مووی ٹون کے چمن لال ڈیسائی سے ملا اور خواہش ظاہر کی کہ اُسے اسٹوڈیو میں کام مل جائے۔ اصل میں اُس

کا مقصد یہ تھا۔ کہ اُسے ایکٹنگ کا موقع دیا جائے۔ چمن لال گجراتی اور ڈلیسائی تھا۔ اُس نے وی، ایچ کو ملازم رکھ لیا۔ اُس کے کہنے پر چند ڈائرکٹروں نے آزمائش کے طور پر مختلف فلموں میں تھوڑا تھوڑا کام دیا۔ اور اس نتیجے پر پہنچے۔ کہ اُس کو پھر آزمانا بہت بڑی خطا ہے، چنانچہ وہ کچھ عرصے کے لئے بیکار ساگر مووی ٹون میں پڑا ایڑیاں توڑتا رہا۔

اس دوران میں مسٹر ہمانسو رائے بمبے ٹاکیز قائم کر چکے تھے۔ جس کے متعدد فلم کامیاب بھی ہو چکے تھے۔ اس ادارے کے متعلق مشہور تھا۔ کہ تعلیمیافتہ لوگوں کی قدر کرتا ہے۔ یہ درست بھی تھا۔ چنانچہ ڈلیسائی قسمت آزمائی کیلئے وہاں پہنچا۔ دو تین چکر لگانے اور مختلف سفارشی خطوط حاصل کرنے کے بعد مسٹر ہمانسو رائے سے ملا۔ ہمانسو رائے نے اس کی شکل و صورت اور اس کی تمام کمزوریوں کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے ایک خاص کردار وضع کیا۔ اور ہندوستانی اسکرین کو ایک ایسا ایکٹر بخشا جو ایکٹنگ سے بالکل ناآشنا تھا۔

پہلے ہی فلم میں وی، ایچ ڈلیسائی فلم بینوں کی توجہ کا مرکز بن گیا۔ بمبے ٹاکیز کے عملے کو شوٹنگ کے دوران میں جو مشکلات پیش آئیں۔ وہ بیان سے باہر ہیں، سب کی قوتِ برداشت جواب دے دے جاتی تھی۔ مگر وہ اپنے تجربے میں ڈٹے رہے، آخر کامیاب رہے۔ اس فلم کے بعد ڈلیسائی بمبے ٹاکیز کے فلموں کا جزو لاینفک بن گیا۔ اُس کے بغیر بمبے ٹاکیز کا فلم غیر مکمل اور روکھا پھیکا سمجھا جاتا تھا۔

ڈلیسائی اپنی کامیابی پہ خوش تھا۔ مگر اُس کو حیرت ہرگز نہیں تھی۔ وہ سمجھتا تھا۔ کہ اس کی کامیابی اُس کی ذہانت و ذکاوت اور انتھک کوششوں کا نتیجہ ہے، مگر خدا بہتر جانتا ہے۔ کہ ان تمام چیزوں کا اُس کی شہرت اور کامیابی میں ذرّہ برابر دخل نہیں تھا۔ یہ صرف قدرت کی ستم ظریفی تھی۔ کہ وہ فلموں کا سب سے بڑا ظریف بن گیا تھا۔

میری موجودگی میں اُس نے فلمستان کے تین فلموں میں حصہ لیا۔ ان تین فلموں کا نام علی الترتیب یہ ہے "چل چل رے نوجوان"، "شکاری" اور "آٹھ دن"۔ ہر فلم کی تیاری کے دوران میں ہم اُس کی طرف سے متعدد بار مایوس ہوئے۔ مگر اشوک اور مکرجی چونکہ مجھے بتا چکے تھے۔ کہ اُس سے کام لینے کے لئے پِتّا قطعی طور پر مار دینا پڑتا ہے۔ اس لئے مجھے اپنی جلد گھبرا جانے والی طبیعت کو قابو میں رکھنا پڑا۔ ورنہ بہت ممکن تھا۔ کہ میں "چل چل رے نوجوان" کی شوٹنگ ہی کے دوران میں دوسرے جہان کو چل پڑتا۔ ویسے کبھی کبھی غصّے کے عالم میں یہ خواہش بڑی شدّت سے پیدا ہوتی تھی۔ کہ کیمرہ اُٹھا کر اُس کے سر پر دے مارا جائے۔ مائکروفون کا پورا بُوم اُس کے حلق میں ٹھونس دیا جائے۔ اور سارے بلب اُتار کر اُس کی لاش پر ڈھیر کر دیئے جائیں۔ مگر جب اس مقصد سے اُس کی طرف دیکھتے تو یہ سفاکانہ عزم ہنسی میں تبدیل ہو جاتا۔

مجھے معلوم نہیں عزرائیل علیہ السلام نے اُس کی جان کیوں کر لی ہوگی۔ کیونکہ اُس کو دیکھتے ہی ہنسی کے مارے اُن کے پیٹ میں بل پڑ پڑ گئے ہوں گے۔ مگر سنا ہے۔ کہ فرشتوں کے پیٹ نہیں ہوتا۔ کچھ بھی ہو ڈلیائی کی جان لیتے ہوئے، وہ یقیناً ایک بہت ہی دلچسپ تجربے سے دوچار ہوئے ہوں گے۔

جان لینے کا ذکر آیا تو مجھے "شکاری" کا آخری سین یاد آگیا۔ اس میں ہمیں ڈلیائی کی جان لینا تھی ـــــ انھیں بے رحم جاپانیوں کے ہاتھوں زخمی ہو کر مرنا تھا۔ اور مرتے وقت اپنے ہونہار اور بہادر ساگر د بادل (اشوک) اور اُسکی محبوبہ دیرا سے مخاطب ہو کر یہ کہنا تھا۔ کہ وہ اس کی موت پر مغموم نہ ہوں اور اپنا نیک کام کئے جائیں۔ مکالموں کی صحت ادائگی کا سوال حسبِ معمول مشکل تھا مگر اب یہ مصیبت درپیش تھی۔ کہ ڈلیائی کو کس انداز سے مارا جائے۔ کہ لوگ نہ ہنسیں

میں نے تو اپنا فیصلہ دیا تھا۔ کہ اس کو اگر سچ مچ بھی مار دیا جائے۔ تو لوگ ہنسیں گے وہ کبھی یقین ہی نہیں کریں گے۔ کہ ڈلیبائی مر رہا ہے یا مر چکا ہے۔ اُن کے ذہن میں ڈلیبائی کی موت کا تصور آ ہی نہیں سکتا۔

میرے اختیار میں ہوتا تو میں نے یقیناً یہ آخر کا سین حذف کر دیا ہوتا۔ مگر مشکل یہ تھی۔ کہ کہانی کا بہاؤ ہی کچھ ایسا تھا۔ کہ انجام میں اُس کیریکٹر کی موت ضروری تھی۔ جو کہ اُسے سونپا گیا تھا کئی دن ہم سوچتے رہے، کہ اس مشکل کا کوئی حل مل جائے مگر ناکام رہے، اب اس کے سوا اور کوئی چارہ نہیں تھا۔ کہ اُسے مرتا دکھایا جائے۔ مکالموں کی صحت اب ثانوی اہمیت رکھتی تھی۔ جب ریہرسلیں کی گئیں۔ تو ہم سب نے نوٹ کیا۔ کہ وہ نہایت ہی مضحکہ خیز طریقے پر مرتا ہے، اشوک اور ویرا سے مخاطب ہوتے ہوئے وہ کچھ اس انداز سے اپنے دونوں ہاتھ ہلاتا ہے، جیسے کوک بھرا کھلونا، اُس کی یہ حرکت بہت ہی خندہ خیز تھی۔ ہم نے بہت کوشش کی کہ وہ ساکت پڑا رہے، اور اپنے بازوؤں کو جنبش نہ دے۔ مگر دماغ کی طرح اُس کا جسم بھی اُس کے اختیار سے باہر تھا۔

بڑی دیر کے بعد آخر اشوک کو ایک ترکیب سوجھی، اور وہ یہ تھی کہ جب سین شروع ہو، تو ویرا اور وہ دونوں اُس کے ہاتھ پکڑ لیں۔ یہ ترکیب کارگر ثابت ہوئی۔ سب نے اطمینان کا سانس لیا۔ لیکن جب پردے پر یہ فلم پیش ہوا۔ اور ڈلیبائی کی موت کا یہ منظر آیا۔ تو سارا ہال قہقہوں سے گونج اُٹھا —— ہم نے فوراً دوسرے شو کے لئے اس کو قینچی سے مختصر کر دیا۔ مگر تماشائیوں کے رد عمل میں کوئی تبدیلی واقع نہ ہوئی۔ آخر تھک ہار کر اُس کو ویسے کا ویسا رہنے دیا۔

ڈلیبائی انجہانی بے حد کنجوس تھا۔ کسی دوست پر ایک دمڑی بھی خرچ نہیں کرتا تھا۔ بڑے عرصے کے بعد اُس نے قسطوں پر اشوک سے اُس کی پرانی موٹر خریدی۔

وہ خود چونکہ ڈرائیو کرنا نہیں جانتا تھا۔ اس لیئے ایک ملازم رکھنا پڑا۔ مگر یہ ملازم ہر دسویں پندرھویں روز بدل دیا جاتا تھا۔ مَیں نے ایک روز اُس کی وجہ دریافت کی تو ڈیسائی گول کر گیا۔ لیکن مجھے ساؤنڈ ریکارڈسٹ جگتاپ نے بتایا کہ ڈیسائی صاحب ایک ڈرائیور رکھتے ہیں۔ نمونے کے طور پر اُس کا کام دس بارہ روز دیکھتے ہیں۔ اور پھر اُسے "کنڈم" کر کے دوسرا رکھ لیتے ہیں۔ یہ سلسلہ کافی دیر تک جاری رہا۔ مگر اسی دوران میں اُس نے خود موٹر چلانا سیکھ لیا۔

آنجہانی کودے کی شکایت بہت عرصے سے تھی۔ یہ مرض لاعلاج قرار دے دیا گیا تھا۔ کسی کے کہنے پر اُس نے ہر روز دوا کے طور پر تھوڑی سی خشک بھنگ کھانا شروع کی تھی۔ اب وہ اس کا عادی بن گیا تھا۔ شام کو سردیوں کے موسم میں برانڈی کا آدھا پیگ بھی پیتا تھا۔ اور خوب چہکا کرتا تھا۔

"آٹھ دن" میں ایک سین ایسا تھا۔ کہ اُسے پانی کے ٹب میں بیٹھنا تھا۔ موسم خوشگوار تھا۔ مگر اُس کی حد سے نازک طبیعت کے لیئے ناقابلِ برداشت حد تک سرد تھا۔ ہم نے اس کے پیشِ نظر پانی گرم کرا دیا۔ اور ساتھ ہی پروڈکشن منیجر سے کہہ دیا۔ کہ برانڈی تیار رکھے۔ جن اصحاب نے یہ فلم دیکھا ہے، اُن کو یہ منظر ضرور یاد ہوگا۔ جس میں ٹیکم لالہ (ڈیسائی) سرزمیندر کے فلیٹ کے غسل خانے میں ٹب میں بیٹھا ہے، سر پر برف کی تھیلی ہے۔ ایک چھوٹا پنکھا چل رہا ہے۔ اور وہ شراب کے نشے میں دھت یہ کہہ رہا ہے۔ "چاروں طرف سمندر ہی سمندر ہے۔ اوپر برف کا پہاڑ ہے —— وغیرہ وغیرہ۔"

شوٹنگ ختم ہوئی۔ تو جلدی جلدی ڈیسائی کے کپڑے تبدیل کرائے گئے، اُس کے بدن کو اچھی طرح خشک کیا گیا۔ پھر اُس کو ایک پیگ برانڈی کا دیا گیا۔ یہ اُس کے حلق سے نیچے اُتری تو اُس نے بہکنا شروع کر دیا۔ اتنی قلیل مقدار

ہی نے اُسے پورا شرابی بنا دیا۔ کمرے میں صرف میں موجود تھا۔ چنانچہ وہ مجھے لکنت بھرے لہجے میں اپنے تمام کارناموں کی داستان سنانے لگا۔ کچہریوں میں وہ کیسے مقدمے لڑتا تھا۔ اور کس شاندار اور زوردار طریقے پر اپنے مؤکلوں کی وکالت کرتا تھا۔

ڈلیبائی قائدِ اعظم محمد علی جناح مرحوم اور مسٹر بھولا بھائی ڈلیبائی کی قانوندانی اور اُن کے زورِ وکالت کا بہت معترف تھا۔ قائدِ اعظم مرحوم سے وہ کئی بار شرف ملاقات حاصل کر چکا تھا۔ اور متعدد مرتبہ عدالتِ عالیہ میں اُن کی قانونی موشگافیاں سُن چکا تھا۔

غالباً "آٹھ دن" فلمانے ہی کا زمانہ تھا۔ کہ حکومتِ پنجاب نے زیرِ دفعہ ۲۹۲ میرے وارنٹ جاری کئے۔ میرے افسانے "بو" پر فحاشی کا الزام تھا۔ اس کا ذکر ڈلیبائی سے ہوا۔ تو اس نے اپنی قانونی واقفیت بگھارنا شروع کر دی۔ دفعتاً مجھے ایک دلچسپ شرارت سوجھی۔ وہ یہ کہ اپنے مقدمے کی پیروی کے لئے اُسے منتخب کروں۔ عدالت میں یقیناً ایک ہنگامہ برپا ہو جاتا۔ جب وہ میری طرف سے پیش ہوتا۔ میں نے اِس کا ذکر مکرجی کیا۔ وہ فوراً مان گئے۔ بات واقعی مزے کی تھی گواہوں کی فہرست بنائی تو میں نے انڈین چارلی نور محمد کو بھی اس میں شامل چارلی اور ڈلیبائی سارے لاہور کو عدالت کے کمرے میں کھینچنے کے لئے کافی تھے۔ میں اس کا تصور کرتا تو میرے سارے وجود میں ہنسی کا چشمہ پھوٹنے لگتا۔ مگر افسوس کہ شوٹنگ کی مشکلات کے باعث میرا یہ دلچسپ خواب پورا نہ ہوا۔

ڈلیبائی نے متعلقہ دفعہ کے متعلق تمام معلومات حاصل کر لی تھیں، جو میرے نزدیک قطعی ضروری نہیں تھیں۔ اس لئے کہ میں تو صرف تفریح چاہتا تھا۔ نور محمد چارلی نے بھی اپنی گواہی کا خاکہ تیار کر لیا تھا۔ مگر وہ اُدھر رنجیت میں کچھ اس طرح

اپنے فلموں کی شوٹنگ میں مصروف تھا۔ کہ ایک دن کے لئے بھی کیمرے چھوڑ نہیں سکتا تھا۔

ڈلیسائی کو افسوس تھا۔ کہ اُسے اپنی قانونی قابلیت دکھانے کا موقعہ نہ ملا۔ کم بخت کی نگاہوں سے یہ بالکل اوجھل تھا۔ کہ مجھے اُس کی اس قابلیت سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ میں تو یہ چاہتا تھا۔ کہ جب وہ عدالت میں پیش ہو تو بار بار بوکھلائے اور جو کچھ کہنا چاہتا ہے۔ بار بار بھول جائے۔ پشاور کے پانی کو پیشاب بنائے اور اتنے ری ٹیک کرائے کہ سب کی طبیعت صاف ہو جائے۔

ڈلیسائی مر چکا ہے۔ زندگی میں صرف ایک بار اُس نے ری ٹیک ہونے نہیں دیا۔ ری ہرسل کئے بغیر اُس نے عزرائیل علیہ السّلام کے حکم کی تعمیل کی اور لوگوں کو مزید ہنسائے بغیر موت کی گود میں چلا گیا۔

---

# پردے کے پیچھے

"آج کی تازہ خبر سُنی آپ نے؟"

"کوریا کی؟"

"جی نہیں!"

"بیگم جوناگڈھ کی؟"

"جی نہیں"

"قتل و غارت گری کی کسی نئی واردات کی؟"

"جی نہیں ـــــ سعادت حسن منٹو کی!"

"کیوں؟ ـــــ مرگیا؟"

"جی نہیں۔ کل گرفتار کرلیا گیا"

"فحاشی کے سلسلے میں؟"

"جی ہاں۔ پولیس نے اس کی خانہ تلاشی بھی لی ہے"

"کوکین یا ناجائز شراب وغیرہ نکلی؟"

"نہیں ـــــ اخباروں میں لکھا تھا کہ اس کے مکان سے کوئی ناجائز چیز برآمد نہیں ہوئی۔"

"لیکن اس کا وجود بذاتِ خود ناجائز ہے۔"

"جی ہاں۔ کم از کم حکومت تو یہی سمجھتی ہے۔"

"پھر اسے برآمد کیوں نہ کیا گیا؟"

"یہ برآمد اور درآمد کا معاملہ حکومت کے اپنے ہاتھوں میں ہے جسے چاہے برآمد کرے، جسے چاہے درآمد کرے۔ سچ پوچھئے تو یہ کام حکومتوں ہی کے ہاتھ میں ہونا چاہیئے۔ وہ اس کا سلیقہ جانتی ہے۔"

"اس میں کیا شک ہے؟"

"تو کیا خیال ہے آپ کا ـــــ اس مرتبہ تو منٹو کو پھانسی کی سزا ضرور ملنی چاہیئے۔"

"مل جائے تو اچھا ہے ـــــ روز روز کا کانٹا ختم ہو۔"

"آپ نے ٹھیک کہا ہے۔ "ٹھنڈا گوشت" کے بارے میں ہائیکورٹ نے اس کے خلاف جو فیصلہ دیا ہے اس کے بعد تو اس کم بخت کو خود بخود مر جانا چاہیئے تھا ـــــ میرا مطلب ہے اُسے خودکشی کر لینی چاہیئے تھی۔"

"اگر وہ اس کوشش میں ناکام رہتا۔"

"تو اس پر یقیناً مقدمہ چلتا، کہ اس نے اپنی جان لینے کی کوشش کی!"

"میرا خیال ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ خودکشی سے باز رہا۔ وگرنہ وہ باز رہنے والا آدمی نہیں۔"

"تو آپ کا مطلب ہے کہ وہ اپنی فحاشی جاری رکھے گا"

"اجی حضرت، یہ اس پہ پانچواں مقدمہ ہے۔ اگر اُسے باز رہنا ہوتا، تو وہ پہلے مقدمے کے بعد ہی تائب ہو کر کوئی شریفانہ کام شروع کر دیتا"

"مثال کے طور پہ گورنمنٹ کی ملازمت اختیار کر لیتا ـــــ گھی بیچتا ـــــ یا محلہ پیر گیلانیاں کے غلام احمد صاحب کی طرح کوئی دوا ایجاد کر لیتا"

"جی ہاں، ایسے سینکڑوں شریفانہ کام ہیں، مگر وہ پرلے درجے کا ہٹ دھرم ہے۔ لکھے گا اور ضرور لکھے گا"

"معلوم ہے آپ کو، اس کا انجام کیا ہوگا؟"

"کچھ بُرا ہی نظر آتا ہے"

"چھ مقدمے اس پہ پنجاب میں چلیں گے، دس سندھ میں، چار صوبہ سرحد میں، تین مشرقی پاکستان میں ـــــ وہ ان کی تاب نہ لا کر پاگل ہو جائے گا"

"دو مرتبہ پاگل تو ہو چکا ہے"

"یہ اس کی دوراندیشی تھی۔ ریہرسل کر رہا تھا، تاکہ جب سچ مچ پاگل ہو جائے تو پاگل خانے میں آرام سے رہے"

"پاگل ہو کر کیا کرے گا؟"

"پاگلوں کو ہوشمند بنانے کی کوشش کرے گا"

"یہ بھی جرم ہے"

"معلوم نہیں ـــــ یہ کوئی وکیل ہی بتا سکتا ہے کہ تعزیراتِ پاکستان

میں اس کے لئے کوئی دفعہ موجود ہے یا نہیں "

"ہونی چاہیئے۔ پاگلوں کو ہوشمند بنانا دفعہ ۲۹۲ کی روشنی میں تو بہت خطرناک جرم معلوم ہوتا ہے "

" دفعہ ۲۹۲ کے بارے میں تو اب ہائی کورٹ نے "ٹھنڈا گوشت" کا فیصلہ کرتے ہوئے صاف طور پہ کہہ دیا ہے، کہ قانون کو مصنف کی نیّت سے کوئی واسطہ نہیں، وہ نیک ہو یا بد، قانون کو صرف یہ دیکھنا ہے، کہ میلان کیا ہے ؟"

" اسی لئے تو میں عرض کر رہا تھا، کہ پاگلوں کو ہوشمند بنانے کے فعل میں نیّت کیسی بھی ہو، اس کے میلان کو زیر غور رکھنا ہوگا ـــــ اور ظاہر ہے کہ اس فعل کا میلان کسی صورت میں بھی بے ضرر قرار نہیں دیا جا سکتا "

" یہ قانونی موشگافیاں ہیں ان سے ہمیں دور رہنا چاہیئے "

" آپ نے بہت اچھا کیا، جو بروقت تنبیہ کر دی۔ کیونکہ ایسی باتوں کے متعلق سوچنا ہی از خود ایک بڑا سنگین جرم ہے "

" لیکن حضرت ـــــ میں سوچتا ہوں، اگر منٹو سچ مچ پاگل ہو گیا تو اس کی بیوی بچوں کا کیا ہوگا۔"

" اس کی بیوی بچے جائیں جہنّم میں۔ قانون کو ان سے کیا واسطہ ؟"

" درست ہے۔ لیکن حکومت کیا ان کی مدد نہیں کرے گی ؟"

" ہاں ـــــ حکومت ـــــ حکومت کی بات جُدا ہے ـــــ میرا خیال، ہے اسے ضرور کرنی چاہیئے ـــــ اور کچھ نہیں، تو اخباروں میں اس بات کا اعلان کر دینا چاہیئے، کہ وہ اس کے متعلق غور کر رہی ہے "

"جب تک غور ہوگا، تب تک معاملہ صاف ہو جائے گا "

"ظاہر ہے ـــــ اب تک ہوتا تو ایسا ہی رہا ہے"

"لعنت بھیجئے منٹو اور اس کی بیوی بچوں پر ـــــ آپ یہ بتایئے ہائی کورٹ کے فیصلے کا اردو ادب پر کیا اثر ہوگا؟"

"اردو ادب پر بھی لعنت بھیجئے"

"نہیں صاحب ایسا نہ کہئے ـــــ سنا ہے کہ ادب قوم کا بہت بڑا سرمایہ ہوتا ہے"

"ہوگا بھائی ـــــ ہم تو اسے سرمایہ کہتے ہیں، جو نقدی کی صورت میں بینک میں پڑا ہو"

"لاکھ روپے کی بات کہی آپ نے ـــــ تو مومن، احسن شوق، سعدی، حافظ وغیرہ سب کو دفعہ ۲۹۲ صاف کر دے گی"

"کرنا چاہئے، ورنہ اس کے وجود کا مطلب کیا ہے؟"

"یہ جتنے ادیب اور شاعر بنے پھرتے ہیں، اب ان کو چاہئے کہ ہوش میں آئیں اور کوئی شریفانہ پیشہ اختیار کریں"

"لیڈر بن جائیں"

"صرف مسلم لیگ کے"

"جی ہاں، میرا مطلب یہی تھا ـــــ کسی اور لیگ کا لیڈر بننا فحش ہے"

"بے حد فحش!"

"لیڈری کے اور شریفانہ پیشے موجود ہیں۔ ڈاکخانوں کے باہر بیٹھ کر پاکیزہ عبارت میں خطوط نویسی کریں۔ دیواروں پر اشتہار لکھیں،

بے روزگاروں کے دفتر میں کلرک ہو جائیں۔ نیا نیا ملک بنا ہے۔ ہزارہا آسامیاں خالی ہیں، کہیں بھی سما جائیں۔"

"جی ہاں، اتنی خالی زمین پڑی ہے۔"

"حکومت سوچ رہی ہے کہ طوائفوں اور رنڈیوں کے لئے راوی کے پاس ایک بستی بنا دے، تاکہ شہر کی غلاظت دور رہو۔ کیوں نہ اُن شاعروں، افسانہ نگاروں اور ادیبوں کو بھی ان میں شامل کر لیا جائے۔"

"بہت اچھا خیال ہے۔ یہ لوگ وہاں خوش رہیں گے۔"

"لیکن انجام کیا ہوگا؟"

"انجام کی کون سوچتا ہے۔ جو ہونا ہوگا، ہو جائے گا۔"

"ہاں وہاں پر طے جھک مارتے رہیں، لوہے کو لوہا کاٹتا ہے۔ فحاشی کو فحاشی کاٹتی رہے گی۔"

"بڑا دلچسپ سلسلہ رہے گا۔"

"منٹو کو تو خاص طور پہ وہاں اپنی دل چسپی کا من بھاتا سامان مل جائے گا۔"

"لیکن وہ کم بخت ان کا مُجرا سننے کی بجائے اُن کے بارے میں لکھے گا۔ کئی سوگندھیاں، کئی سلطانائیں پیش کرے گا۔"

"کئی خوشیا، کئی ڈھونڈو۔"

"معلوم نہیں کم بخت کو ایسے گرے ہوئے اِنسانوں کو اُٹھانے میں کیا مزا آتا ہے۔ ساری دنیا انہیں ذلیل اور حقیر سمجھتی ہے مگر وہ ان کو سینے سے لگاتا ہے، ان کو پیار کرتا ہے۔"

"اُن کی بہن عصمت نے اس کے متعلق کچھ ٹھیک ہی کہا تھا، کہ منٹو کو عجیب و غریب تہلکہ ڈال دینے والی، اور سوتوں کو چونکا دینے والی چیزوں سے بڑی رغبت ہے۔ وہ سوچتا ہے اگر بہت سے لوگ سفید کپڑے پہنے بیٹھے ہوں، اور کوئی کیچڑ مل کر وہاں چلا جائے، تو سب ہکا بکا رہ جائیں گے ——— سب لوگ روپیٹ رہے ہوں، وہاں ایک اونچا قہقہہ لگا دو، تو سب دم سادھ کر ٹکر ٹکر منہ دیکھنے لگیں گے۔ بس دھاک بیٹھ جائے گی، سکہ جم جائے گا۔"

"اس کا بھائی ممتاز حسین کہتا ہے۔ وہ نیکی کی تلاش میں نکلتا ہے اور اس کی ایک کرن ایسے انسان کے پیٹ سے نکالتا ہے، جس کے بارے میں آپ اس قسم کی کوئی توقع ہی نہیں رکھتے ——— یہ ہے منٹو کا کارنامہ۔"

"یہ بڑی لغو حرکت ہے، بلکہ فحش حرکت ہے، کہ ایسے انسان کے پیٹ سے روشنی کی ایک کرن نکالی جائے، جس میں سوائے انتڑیوں اور مفلے کے اور کچھ نہ ہو۔"

"اور کیچڑ لا کے سفید پوش لوگوں کے درمیان کود پڑنا۔"

"یہ اور بھی فحش ہے۔"

"یہ اتنی کیچڑ لاتا کہاں سے ہے؟"

"معلوم نہیں ——— کہیں نہ کہیں سے ڈھونڈ نکالتا ہے۔"

"گندگی کا غواص جو ٹھہرا۔"

"آیئے۔ ہم دعا مانگیں کہ خدا ہمیں اس کے لعنتی وجود سے نجات دلائے اس میں خود منٹو کی بھی نجات ہے۔"

"اس میں کیا شک ہے۔"

"اے خدا ـــــ اے رب العالمین ـــــ اے رحیم ـــــ اے کریم ـــــ ہم دو گنہگار بندے تیرے حضور گڑگڑا کر دعا مانگتے ہیں، کہ تو سعادت حسن منٹو کو ـــــ جس کے والد کا نام غلام حسن منٹو ہے۔ اور جو بہت شریف اور پرہیزگار اور خدا ترس آدمی تھا، اس دنیا سے اُٹھا لے، جہاں وہ خوشبوئیں چھوڑ دیتا ہے، اور بدبوؤں کی طرف بھاگتا ہے۔ نور میں وہ اپنی آنکھیں نہیں کھولتا، لیکن اندھیرے میں ٹھوکریں کھاتا پھرتا ہے۔ ستر سے اس کو کوئی دلچسپی نہیں، وہ انسانوں کے ننگ دیکھتا ہے ـــــ مٹھاسوں سے اسے کوئی رغبت نہیں ـــــ کڑواہٹوں پر البتہ جان دیتا ہے ـــــ گھریلو عورتوں کی طرف وہ آنکھ اُٹھا کر بھی نہیں دیکھتا، لیکن بیسواؤں سے گھُل مل کر باتیں کرتا ہے۔ ـــــ صاف اور شفاف پانی چھوڑ کے بدروؤں میں نہاتا ہے ـــــ جہاں رونا ہے وہاں ہنستا ہے ـــــ جہاں ہنسنا ہے وہاں روتا ہے ـــــ کوٹھوں کی دلالی میں جو اپنا منہ کالا کرتے ہیں، اُن کی کالک صاف کر کے ہمیں دکھاتا ہے ـــــ تجھے بھول کر شیطان کے پیچھے مارا مارا پھرتا ہے، جس نے تیری عدول حکمی کی تھی۔

اے رب العالمین ـــــ اس شر انگیز ـــــ نجس پسند ـــــ اور شریر انسان کو اس دنیا سے اُٹھا لے۔ جس میں وہ بدکرداری، اور بداطواری کے نامۂ اعمال کی سیاہیاں مٹانے کی کوشش میں مصروف ہے ـــــ اے خدا ـــــ وہ بہت شر پسند ہے ـــــ عدالتوں کے فیصلے اس کا ثبوت ہیں ـــــ لیکن یہ ارضی عدالتیں ہیں

تو اسے اس دنیا سے اُٹھا اور اپنی آسمانی عدالت میں اس کے خلاف مقدمہ چلا اور اس کو قرار واقعی سزا دے ——— لیکن دیکھ، اسے ادائیں بہت آتی ہیں، ایسا نہ ہو تجھے اس کی کوئی ادا پسند آجائے ——— لیکن سب کچھ جاننے والا ہے ——— ہماری صرف یہ دعا ہے کہ وہ اس دنیا میں نہ رہے ——— رہے تو ہم جیسا بن کے رہے، جو ایک دوسرے کے عیبوں پر پردہ ڈالتے ہیں۔

ایں دعا از من و از جملہ جہاں آمین باد!

# ہماری اپنی مطبوعات

| | |
|---|---|
| **جب بتی بجھ گئی** افسانے<br>مرتبہ ایم، سکندر قیمت دو روپے | **چندر کلا** ناول<br>مصنف جمنا داس اختر قیمت دو روپے |
| **جلن** (ناول)<br>مصنف جمنا داس اختر قیمت دو روپے | **سسرال** (ناولٹ)<br>مصنف شوکت تھانوی۔ قیمت دو روپے |
| **گناہ کے افسانے** (افسانے)<br>مرتبہ شہزادہ سلیم قیمت دو روپے چار آنے | **زہریلا حسن** (ناول)<br>مصنف اشفاق احمد قیمت دو روپے |
| **پیار** (ناول)<br>مصنف زکی انور۔ قیمت تین روپے | **آؤ بھاگ چلیں** (ناولٹ)<br>مصنف اے، حمید۔ قیمت ایک روپیہ آٹھ آنے |

مکتبہ رنگین۔ پوسٹ بکس نمبر ۱۲۷۴ دہلی

ISCUS LIBRARY
Near A. T. T. High School,
MALEGAON DIST. NASIK.